APRIL
2023

جدید ترادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

From One Loneliness to Another
Translating a poem is like building a creative bridge between two languages and cultures. Salim ur Rahman has built wonderful creative bridges between Hamid Yazdani's Urdu poems and his English readers. When we read those translations, we realize how much Hamid azdani is fascinated with nature, seasons and time. He introduces us to the magic and mystery of mornings and evenings, days and nights, springs and falls, summers and winters. Since a poe's success depends upon how much he can help his readers see extra-ordinary in the ordinary, I consider Hamid Yazdani a highly successful poet. Through his poetry he can inspire his readers to see life through his unique eyes.
- Dr. Khalid Sohail
Reading Hamid Yazdani has always been a treat for me. His poems hold my hand and take me to a wonderland where I keep wandering with my eyes wide open like Alice. While reading his enchanting poetry, I am always lost in the process of being and becoming, the quiet introspection and an alluring nostalgia. When you come across a work of translation that elevates itself to the status of trans-creation, you feel as if the book was written twice. This is what happened to me while going through my favourite poet Hamid Yazdani's poems rendered into English by Muhammad Salim ur Rahman.
Salim sb. who is an eminent writer and translator.
- Prof. Salman Basit
Hamid Yazdani
M. Salim-ur- Rahman
ISBN 978-1-927874-59-2
52000 >
9 781927 874592
GREENZONE
PUBLISHING

From One Loneliness to Another
Urdu Poems By:
Hamid Yazdani
Translated By:
M. Salim-ur- Rahman

لاپتہ کا پتہ
شاہین مفتی

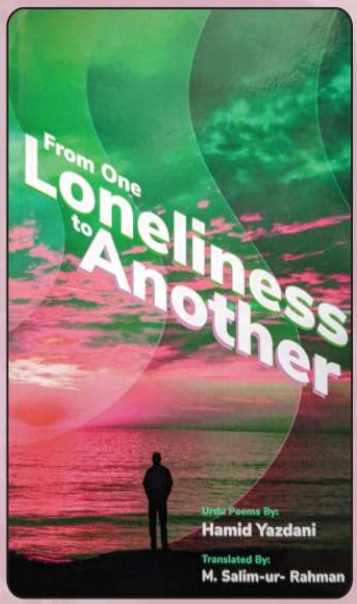

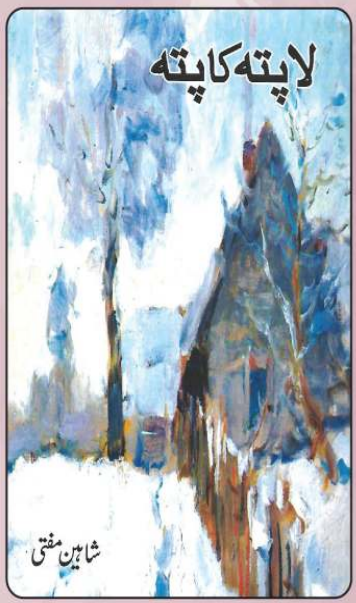

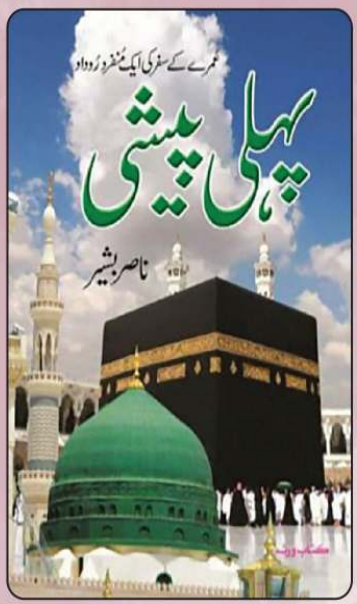

عمرے کے سفر کی ایک مُنفرد رُوداد
پہلی پیشی
ناصر بشیر

غزل

زُلفیں کھول کے رنجوری کی
کس کے دُکھوں کی مشہوری کی

آپ تلاشے ، آپ تراشے
بات نہ تھی یہ مجبوری کی

رُوپ تمہارا ، ہجر کا تارا
آنکھیں شمعیں مہجوری کی

کتنے کاغذ راکھ ہوئے ہیں
ایک تمنّا کیا پُوری کی

ایک سوال لیے پھرتے ہیں
راہ نہ دیکھی منظوری کی

سانس کی ڈوری ٹوٹ نہ جائے
بات چلی ہے پھر ڈوری کی

لفظ بھی اپنے ہاتھ نہ آئے
لاکھ قلم کی مزدوری کی

شہر بھی صحرا ٹھہرا خالد
پگ پگ ڈاریں کستُوری کی

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-6
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ
بیاض
لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 31 - اپریل 2023 - شمارہ نمبر: 4

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران
کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق:
قیمت: 100 روپے

سالانہ زرِ اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700
فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517
Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر نزد مارٹیکسٹائل اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سید ریاض حسین زیدی، اشرف نقوی، ریاض ندیم نیازی	7 تا 9
2	نعت	جلیل عالی، نسیم سحر، خاور اعجاز، تابش کمال، اعجاز دانش نوید صادق، غلام جیلانی شمس، نبیل احمد نبیل، حسنین مظہری	10 تا 18
3	منقبت	جلیل عالی	19
4	تصوف	سلیمان عبداللہ ڈار	20 تا 23
5	مضامین	محمد ارشاد، انور مسعود، نجیب جمال، حامد یزدانی امیر حسین جعفری، ناصر نقوی، شاہد اشرف سرور حسین نقشبندی، عمیرہ احمد، م - م - مغل عادل سعید قریشی، طلحہ غفور، ذکا اللہ انجم ملغانی	24 تا 81
6	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	82 تا 90
7	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، انور شعور، سید ریاض حسین زیدی نسیم سحر، رشید آفرین، راحت سرحدی، خاور اعجاز، شاہنواز زیدی طالب انصاری، اسلام عظمی، محمد انیس انصاری، ناصر علی سید نذر عابد، صفدر صدیق رضی، منظور ثاقب، سعداللہ شاہ فراست رضوی، محمد اشرف کمال، رخشندہ نوید، میتھیو محسن	91 تا 183

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
7	غزلیں	شوکت محمود شوکت، ہمایوں پرویز شاہد، افتخار شاہد، عقیل رحمانی مسعود احمد، احمد جلیل احمد سبحانی آکاش، انور حسن، محمد شفیق انصاری ظہور چوہان، رضا اللہ حیدر، اعجاز دانش، دانش عزیز فیض رسول فیضان، ریاض ندیم نیازی، شہاب صفدر، احمد حسین مجاہد واجد امیر، ذکی طارق، اکرم ناصر، افضل ہزاروی، زبیر خیالی عزیز فیصل، رخسانہ فیض، شاہد مالکی، عثمان حنیف، فیصل زمان چشتی نادیہ سحر، اصغر علی بلوچ، عمران اعوان، محمد اشفاق بیگ وسیم جبران، شمر جمال، کوی گل، محمد علی ایاز، احمد محسود، آفتاب خان عنبرین خان، صغیر احمد صغیر، نور کمال شاہ، سعدیہ بشیر آفتاب محمود شمس، اکرم جاذب، علمدار حسین، حسن پرویز مید امر مہکی، سمیرا یوسف، شعیب عدن، اکمل حنیف، مستحسن جامی رمیض نقوی، احمد سجاد بابر، عزیز قدیر مغل، نائلہ راٹھور، ارشد نعیم محسن رضا شافی، طارق جاوید، حسیب الحسن، سرور فرحان مہر علی، رانا محمد شاہد، محمود کیفی، محمد نور آسی، نسرین سید فخر عباس، سید تیمو کاظمی، محمد عرفان خان، بشیر احمد حبیب عقیل عباس، عمر قیاز قائل، گل فراز، امتیاز انجم	91 تا 183
8	افسانے	ابدال بیلا، فرحت پروین، کلیم خارجی، اقبال خان یوسفزئی سعدیہ رحمان، محمد ارشاد انصاری، حمزہ حسن شیخ	184 تا 215
9	طنز و مزاح / خاکے	نسیم سحر، ہمایون خان	216 تا 222
10	نظمیں	آصف ثاقب، ایوب خاور، فرحت پروین سید عارف معین بلے، نسیم نازش، شبہ طراز، احمد جلیل احمد سبحانی آکاش، ریاض ندیم نیازی، زعیم رشید عاصم بخاری، امجد بابر، نائلہ راٹھور، سید نواز شاہ بخاری	223 تا 236
11	خطوط	نسیم سحر، محمد اشرف کمال، محمد شفیق انصاری رانا محمد شاہد، فیض رسول فیضان	237 تا 241

حمد

رب کریم! تیری عنایت ہے بے بہا
بے خانماں کو گھر جو دیا تو نے خوش نما

بے مثل کیسا حقِ رفاقت ہوا ادا
دیکھے نہ مصطفیٰؐ کہیں تجھ سے کبھی جدا

ہریالیوں نے روحِ جہاں کو سجا دیا
شاداب تیرا گھر ملا ، گنبد ملا ہرا

دکھلائی تو نے راہ جو ہے راہِ مستقیم
سمجھا دیا کہ کام نہ ہرگز ہو ناروا

بے رہروی کی راہ میں دیوار کھینچ دی
پورا ہوا چراغِ ہدایت کا مدعا

تو چاہے کائنات اندھیروں میں جا گھرے
تیرا کرم ہے تو نے اندھیروں کو دی ضیا

عہدِ ستم میں غیرتِ ایماں خطر میں تھی
ہے تیرا فیض تو نے مدینہ بسا دیا

غیظ و غضب سے تیرے ہیں کفار دم بخود
شرکِ خفی جلی کو جہاں سے مٹا دیا

میں ہوں ریاض اس کی خدائی کا معترف
میرا سرِ نیاز ہے سجدے میں جا گرا

سید ریاض حسین زیدی

حمدیہ

تُو ازل سے ہے، ابد تک ہیں زمانے تیرے
جِن و انسان و ملک، سب ہیں دِوانے تیرے

تجھ کو دیکھا تو نہیں، پھر بھی سبھی جانتے ہیں
ہر حقیقت سے حقیقی ہیں فسانے تیرے

تُو کہ لوٹاتا نہیں خالی کبھی بندوں کو
پھر بھی ہر دم بھرے رہتے ہیں خزانے تیرے

تُو ہے وہ بحر، نہیں جس کا کنارہ کوئی
اپنے بندوں کے مگر دل ہیں ٹھکانے تیرے

ذرّہ ذرّہ ہے تری حمد و ثنا میں مصروف
کیسے گونجیں نہ دو عالم میں ترانے تیرے

بے سہارا تجھے ہونے نہ دیا اے اشرف!
تجھ پہ احسان کیے اِتنے، خدا نے تیرے

اشرف نقوی

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

وسعتِ کائنات عشق دِکھا
ربِّ قوسین! نقطۂ پرکار

حمد

ترے ذکر سے لحہ لحہ فروزاں
ترے نور سے ساری دُنیا فروزاں

ترے حکم سے جب نکلتا ہے سورج
تو ہوتے ہیں سب باغ و صحرا فروزاں

تخیّل ترا جلوہ گر جب ہُوا ہے
شبِ تیرہ کو ہم نے دیکھا فروزاں

مرے خانۂ قلب کا ذرّہ ذرّہ
کیا تو نے ہی میرے مولا فروزاں

درخشاں ترے نور سے کہکشائیں
ہے خورشید میں تیرا جلوہ فروزاں

فقط اپنی قدرت سے اے میرے مولا!
یہ عالم کیا تو نے سارا فروزاں

ندیمؔ اب دُعا اور کیا تجھ سے مانگے
ہُنر مَیں نے مِدحت کا پایا فروزاں

ریاض ندیم نیازی

نعتؐ

کب کوئی عشق ترےؐ عشق کا ہم پایہ ہوا
وہی جانیں کہ عطا جن کو یہ سرمایہ ہوا

تھک کے تھم جاتی ہے ہر موجِ زمانہ آخر
کہیں ٹھہرا نہ تریؐ راہ سے رَم آیا ہوا

خیر و انعام کا رستہ ترؐا ایک ایک عمل
حکمتِ نام کا دریا ترؐا فرمایا ہوا

ورد کرتی ہیں ترےؐ نام کا سانسیں دم دم
روح میں یوں ترؐا احساس ہے گہرایا ہوا

نہیں ممکن کہ شفاعت کی نگاہوں میں نہ ہو
دل کہ جو اپنی خطاؤں پہ ہو پچھتایا ہوا

جس سے راضی ہوا تُوؐ وہ ہوا راضی اُس سے
خود خدا نے ہمیں نکتہ ہے یہ سمجھایا ہوا

تیرےؐ اک حرف سے وہ راہ پہ آ سکتا ہے
کوئی کتنا بھی ہو اِس دہر کا بھٹکایا ہوا

طائف و بدر و اُحد نے یہ گواہی دے دی
دل ترؐا تابشِ قرآں کا تھا چمکایا ہوا

عالیِ خستہ تن و جاں پہ کرم ہے تیرؐا
اپنی دہلیز پہ تُوؐ نے ہے جو بٹھلایا ہوا

جلیل عالی

نعت

وہؐ سُن کے عشق میں ڈوبی سطور، خوش ہوں گے
غلام سے مرے آقا حضورؐ خوش ہوں گے

بُلاوا آیا جو عُشّاق کو مدینے سے
بحور و دشت بھی کر کے عبور خوش ہوں گے

خدا کرے یہ مرا خواب سچا ثابت ہو
کہ میری نعت سنیں گے حضورؐ، خوش ہوں گے

اُڑان میں جو کریں گے طوافِ گُنبدِ سبز
تو خوب چہکیں گے اُڑتے طیور، خوش ہوں گے!

پسینہ اُنؐ کا جو پھیلائے گا مہک اپنی
تو ہار مان کے عُود و بخُور خوش ہوں گے

مدینے جاتے ہوئے اس لئے بھی مَیں خوش ہوں
کہ دے کے وہؐ مجھے عجوہ کھجور، خوش ہوں گے

وہؐ نعت گو شُعَرا کے عمل بھی دیکھیں گے
اگر تضاد نہ پایا، حضورؐ خوش ہوں گے

ملاحظہ جو کریں گے مقام آقاؐ کا
یقیں ہے، مُوسیٰ سرِ کوہِ طور خوش ہوں گے

نبیؐ سے عشق جو کرتے ہیں اُن کو جنّت میں
فرشتے دے کے شرابِ طہور خوش ہوں گے

جب اپنی روح میں اِک نغمگی سُنیں گے نسیم
پڑھیں گے لوگ جو تسبیحِ نُور، خوش ہوں گے

نسیمِ سحر

نعتؐ

گزریں گے ہر مقام سے مہتاب تھام کے
جلتے ہیں جن کے دل میں چراغ اُنؐ کے نام کے

وردِ زباں ہے اسمِ مبارک حضورؐ کا
موسم بدل گئے ہیں مرے صبح و شام کے

کھلتی گئیں زمان و مکاں کی بھی سلوٹیں
فیضان ہیں اُنہیؐ کے یہ حسنِ کلام کے

سارے گھروں میں ایک وہ گھر ہے رسولؐ کا
سیکھا زمانہ جس سے ہنر احترام کے

ذرّوں سے پھوٹتے ہیں: مہک، رنگ، روشنی
کیا سلسلے ہیں گنبد و دیوار و بام کے

شہرِ مدینہ مرجعِ عالم ہے اِس لیے
رستے نکل رہے ہیں یہاں سے دوام کے

دو نیم ہو گیا تو اطاعت کے باب میں
رتبے دوچند ہو گئے ماہِ تمام کے

صحرائے جاں میں پھول سے کھلتے ہیں جب بھی مَیں
نذرانے بھیجتا ہُوں درود و سلام کے

ربِ کریم کوئی تسلی ہمارے نام
ہم بھی کھڑے ہیں روضے کی جالی کو تھام کے

نکلے گماں، گناہ، گرانباریوں سے ہم
یہ معجزے محبتِ خیر الانامؐ کے !

آئی سمجھ میں ذاتِ خدا اُنؐ کی ذات سے
معنی بدل گئے وہؐ سجود و قیام کے

فکرِ سخن کچھ اور ہو سرگرمِ جستجو
لائق نہیں زمین یہ گردوں مقام کے

خاور اعجاز

نعتؐ

میرا اعزاز و اِفتخار دُرود
میرے سرکارؐ! بے شمار دُرود

اسمِ احمدؐ! ہزار جاں قُرباں
جسمِ احمدؐ! ہزار بار دُرود

صحنِ جاں میں گُلاب کیوں نہ کِھلیں
پڑھ رہی ہے یہاں بہار دُرود

اس لیے سر جھکائے رکھتا ہوں
بن گیا ہے گلے کا ہار دُرود

آلِ اطہر پہ بے حساب سلام
ذاتِ اَقدسؐ پہ صد ہزار دُرود

خون میں، روح میں ہے تابندہ
وجہِ تسکینِ دِل ، قرار ، دُرود

نعت لکھتے ہیں عشق سے عُشاق
دل سے پڑھتے ہیں جاں نِثار دُرود

کوئی پوچھے دَوائے دِل تابش
اس سے کہنا کہ بار بار ، درود

تابش کمال

نعتؐ

نہیں تمنا ملے ساری کائنات مجھے
حضورؐ چاہیے اک چشمِ التفات مجھے

تمہاری چشمِ عنایت کی جستجو میں شہا
کہاں کہاں لیے پھرتی ہے یہ حیات مجھے

تمہاری بات ہی تحریر کرتا رہتا ہوں
تمہاری بات ہی لگتی ہے اچھی بات مجھے

تمہاری یاد کے سائے میں ہو رہی ہے بسر
تمہاری رحمتیں رکھتی ہیں ساتھ ساتھ مجھے

وہ جس زمین پہ قدسی اترتے رہتے ہیں
اسی زمین پہ مل جائے ایک رات مجھے

تمہارے ذکر کا غلبہ ہے میرے دل پہ حضورؐ
غموں سے دے گا یہی سلسلہ نجات مجھے

عطا ہو خواب میں جس رات آپؐ کا جلوہ
لگے گی رات وہ مثلِ شبِ برات مجھے

حضور جامی سا جذبہ مجھے عنایت ہو
کہ باغ باغ رکھے دل کو تیری نعت مجھے

میں ڈوبتا ہوں تو آتا ہے لب پہ نام ترا
سنبھالتی ہے مصیبت میں تیری ذات مجھے

تمہارے عشق نے مضبوط کر دیا مجھ کو
تمہارے دم سے ہے ہر چیز میں ثبات مجھے

جو ان کا نام عقیدت سے لکھتا رہتا ہے
عطا ہوئی ہے وہ دانش قلم دوات مجھے

اعجاز دانش

نعتؐ

جو داغ دل پہ لگے تھے وہ دھو کے آیا ہوں
میں خوش نصیب، مدینے میں رو کے آیا ہوں

مرے مقام ، مرے مرتبے پہ غور کریں
میں مکّے اور مدینے سے ہو کے آیا ہوں

دل و نظر میں حضوری کی کیفیت تھی عجب
درِ نبی پہ بہت دیر رو کے آیا ہوں

گناہ گار تھا، اپنے کیے پہ روتا رہا
میں آبِ پاک سے دامن بھگو کے آیا ہوں

حرم سے طیبہ تلک آنکھ بھی نہیں جھپکی
عجیب رنگ تھے، دل میں سمو کے آیا ہوں

متاعِ زیست کہا جائے تو بجا ہے نوؔید
میں جوئے اشک میں آنکھیں ڈبو کے آیا ہوں

نوید صادق

نعتؐ

رحمان کی رحمت کا وہ حقدار نہیں ہے
جو ذاتِ محمد کا طلبگار نہیں ہے

ہر خاک کا ذرّہ جو ہُوا شہرِ نبی میں
یاقوت سے بہتر ہے وہ بیکار نہیں ہے

وہ بولیں تو برسات ہو خوشبو کی ہر اک سو
ایسی تو کسی اور کی گفتار نہیں ہے

سرکارِ مدینہ کی شفاعت پہ نظر ہے
محشر میں کوئی اور مددگار نہیں ہے

ہو عود یا عنبر یا کوئی روغنِ گل ہو
آقا کے پسینے سے مہکدار نہیں ہے

ہے عشق اگر شاہِ مدینہ سے تو پھر شمس
کل پل سے گزرنا کوئی دشوار نہیں ہے

غلام جیلانی شمس

نعتؐ

اُنؐ کے ہی لُطف و کرم سے، رہنمائی سے ہوا
یہ جہاں روشن جمالِ مصطفائی سے ہوا

کُھلتے کُھلتے کُھل گیا مجھ پر درِ خُلدِ بریں
معجزہ یہ آپؐ کی مدحت سرائی سے ہوا

مجھ فقیرِ رہ گُزر کو ہیچ ہیں تخت و کُلاہ
یہ کرم اُن کا ہے اور اُن کی گدائی سے ہوا

اُنؐ کی رحمت جوش میں آ کر مدد کو آ گئی
کام مجھ سے بے نوا کا بے نوائی سے ہوا

اُن کی رحمت نے سنوارے میرے دُنیا اور دِیں
دو جہانوں میں بَھلا ان کی بھلائی سے ہوا

آپؐ کی بعثت ہوئی اور تیرگی چھٹنے لگی
دیدہ ور میں بھی جمالِ مصطفائی سے ہوا

نور کے ہالے نبیل آنے لگے میری طرف
لُطفِ بے حد اُن کا مجھ پر خوش ادائی سے ہوا

نبیل احمد نبیل

نعتؐ

یاد جس وقت در و بامِ حرم آتے ہیں
کتنے ہی اشک پسِ دیدۂ نم آتے ہیں

یہ مدینہ ہے شہِ ارض و سما کی بستی
چین کرنے کو یہاں سوختہ دم آتے ہیں

ہو گئے دیکھتے ہی حلقہ بہ گوشِ اسلام
وہ جو ہاتھوں میں لیے تیغِ دو دم آتے ہیں

جب بھی مشکل میں پکاروں کہ کوئی ہے میرا
دفعتاً آتی ہے آواز کہ ہم آتے ہیں

ماہ و خورشید شب و روز سرِ بامِ حرم
بہرِ دیدارِ شہنشاہِ اُمم آتے ہیں

ایک لمحے میں اتر جاتی ہے صدیوں کی تھکن
ہم کہ جس آن تہِ ظلِ عَلَم آتے ہیں

جد و سبطین سے مجھ کو ہے برابر الفت
جب بھی آتے ہیں مجھے یاد بہم آتے ہیں

آپ کے ذکر سے مل جاتی ہے ہمت ہم کو
جب کبھی زیرِ گراں بارِ الم آتے ہیں

حسنین مظہری

منقبت حضرت علیؓ

غلو کی کیا ضرورت ہے علیؓ کی مدح خوانی میں
کمی ہے کون سے اعجاز کی اِس شہ کہانی میں

وہ جب لب کھولتا تو حیرتوں سے دیکھتی دانش
معانی کے سمندر موجزن سادہ بیانی میں

ارادوں کی جوانانہ چمک پیری کے ماتھے پر
بصیرت کی بزرگانہ دمک چشمِ جوانی میں

عطا اس کو ہوئی تھی ایسی بینائی کہ وہ جس سے
خدا کو دیکھ لے کوشش کی رمزِ رایگانی میں

مقامِ بابِ شہرِ علم اُس کے نام ہونا تھا
اک ایسا فہمِ فرقانی تھا اُس کی ترجمانی میں

وہ آئینِ الٰہِ مصطفیٰ کا ایسا شیدا تھا
کہ کر دی جان بھی قربان اس کی پاسبانی میں

کرم اُس کی محبت کا یہ کیا کم ہے کہ ہر لمحے
ہمارے ساتھ رہتا ہے وہ اپنی غائبانی میں

علی کی یاد سینے میں کرو آباد پھر دیکھو
کہ رستے خیر کے کھلتے ہیں کیا کیا زندگانی میں

میں جب گریہ کناں ہوتا ہوں فرطِ شوق سے عالی
نظر آتے ہیں عکس اُس کے مجھے اشکوں کے پانی میں

جلیل عالی

بے قدری

اس کالم کا عنوان بے قدری ہی ہونا چاہیے۔ ہوسکتا ہے خوش ذوق قارئین سوچیں کہ محبوب حقیقی کے بارے میں پیار بھرے کالم جو آپ ان صفحات پر پڑھتے رہتے ہیں ان میں الفاظ کی نشست برخاست روانی سے بہتی ہوئی ندی والی ہونا چاہیے یہ عنوان ذرا تلخ تو ہے مگر مناسب اس لئے ہے کہ منفی رجحانات والے اس عنوان کے اندر بھی اک محبت پوشیدہ ہے محبت کے لوازم پر پورے نہ اُترنے والے عاشق محبت کے پل صراط سے گزرنے والے عاشق صادق محبت کی معاذ اللہ توہین سے ہر دم ڈرنے والے محبّ کہ ایمان بھی تو امید اور خوف کے درمیان رہتا ہے۔ عاشق ڈرتے ڈرتے محبت کرتا ہے اور کرتے کرتے ڈرتا ہے اسے ہر لحظہ یہ خطرہ دامن گیر رہتا ہے کہ کہیں اگلے قدم پر لغزش پا سے واسطہ نہ پڑ جائے کہیں کوئی ایسا کام مجھ سے نا ہو جائے کہ میرا پیارا مالک ناراض ہو جائے یوں تو عاشق کی زندگی میں جتنے بھی کام ہوتے ہیں جتنی بھی دلچسپیاں ہوتی ہیں وہ مالک کی محبت ہی کے رنگ ہوتے ہیں چاہت کے رنگ ہوتے ہیں الفت کبھی کسی رنگ میں ہویدا ہوتی ہے تو کبھی کسی دوسرے رنگ میں رنگ ہی رنگ ساجن کے سنگ اور پھر سنگ سنگ عمر بھر زندگی پھر قوس قزح کے رنگ دل کے آکاش پر پھیلتے جاتے ہیں اک اک قطرہ Prism بنتا جاتا ہے سائنس دان تو یہی کہتے ہیں جب بارش بھی ہو اور دوسری طرف سے سورج نکل آئے تو ہر ہر قطرے پر روشنی پڑتی ہے اور منعکس ہو کر سات رنگوں میں تقسیم ہو جاتی ہے سائنس دانوں کو کیا خبر کہ محبوب حقیقی کی محبت کے سات آٹھ نہیں لاکھوں اربوں کھربوں رنگ ہیں جس طرح محبوب حقیقی خود بے مثل ہے اسی طرح اس کی محبت اور اس کی محبت کے سارے رنگ نہ جانے کتنی اقسام کے ہیں کبھی یہ محبت کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اجاگر ہوتی کبھی قرض خواہ کو مزید ڈھیل دیتے ہوئے نکھرتی ہے کبھی مسکین کو کھانا کھلانے میں نظر آتی ہے کبھی بظاہر اپنی اہانت کروانے میں دکھائی دیتی ہے کبھی معزز ہو کر بھی ساجن کے لئے بے عزت ہونے میں پنہاں ہوتی ہے کبھی چھپ چھپ کر کسی مفلس کی مدد کرنے میں عیاں ہوتی ہے راقم کے اک عزیز تھے

سلیمان عبداللہ ڈار

صاحب ثروت تھے اکثر کہا کرتے تھے زکوٰۃ اس کو دینا ہوگی جہاں وہ "لگے" جو رشتے دار (کسی غلط فہمی کی وجہ سے) انھیں گالیاں دیتے تھے وہ انھیں چھپ چھپا کر زکوٰۃ دیا کرتے تھے۔

بے قدری تو دنیاوی مالک کو برداشت نہیں مالک حقیقی کو کیسے برداشت ہوگی۔ بے قدری اک خطا ہے جسے مالک معاف کر دیتا ہے دھن جگرا مالک کا ہے جو ساری کی ساری طاقتوں قدرتوں کا مالک ہے پھر بھی درگذر کرتا ہے حالانکہ دنیاوی محبتوں میں بھی دیکھا جائے تو قدر نہ کرنا بہت بڑا جرم ہے محبت کی راہوں پر اک ناقابل معافی فروگذاشت ہے مگر کیا کہنے مالک کے اور خالق کے بندے کو شرمندگی سے خجالت سے نارسائی سے ندامت سے بچا کر یہ احساس بھی نہیں ہونے دیتا کہ اس سے اتنا بڑا جرم سرزد ہوا یوں تو مالکوں کی ساری صفات ہی کمال کی ہیں مگر درگذر والی رحمت والی معاف کر دینے والی صفت ایسی ہے کہ راقم کے اک بزرگ فرمایا کرتے تھے۔ اک بار محبوب حقیقی کی ساری صفات کی دوڑ لگی تو رحمت والی صفت سب سے آگے نکل گئی تھی۔

بندہ جب قدر کرنے لگے محبت میں سب کچھ وار دے ہر حکم کے تابع ہو کر ہر خواہش کو تج دے تو خالق اپنے اسرار کا کچھ حصہ محب کے سامنے کھولتا ہے۔ اُٹھتے ہیں حجابات اور ملتے ہیں مقامات کھلتے ہیں۔ مناقب علم الیقین کیا ہے؟ یہ دلائل عقلیہ سے نہیں کھلتا یہ ذوق سے وجد سے حق کی گواہی سے اور امر و نہی سے تعلق بنانے پر سامنے آتا ہے حجابات بشری کے اُٹھ جانے سے محب کے دل کے بالکل عین سامنے نور حقیقت کا ظہور ہونے لگتا ہے پھر بندے کو قطعیت کا پتہ چلتا ہے اللہ جل شانہ کے وعدوں پر اعتبار آتا ہے قلب کو پیار آتا ہے پھر دل کو اطمینان کی بے بہا دولت میسر آتی ہے اس کے نتیجے میں دنیاوی فوائد تو نظر کے سامنے سے خس و خاشاک کی طرح دور بہہ جاتے ہیں بندہ 99 کے پھیر سے نکل کر اک آرام اک سکون اور اک استراحت کی دنیا میں چلا جاتا جہاں جا کر ساری کی ساری دنیاوی تھکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں اس طرح محب اک ایسے عالم میں پہنچ جاتا ہے جو عارف باللہ لوگوں کا عالم ہے۔

یہ انہی کی دنیا ہے اور اک انوکھا جہان ہے وہ مجازی طور پر تو اس دنیا میں ہوتا ہے مگر حقیقی طور پر احوال و مقامات کی روحانی دنیا کے سفر پر نکلتا ہے کہ قدر کرنے والوں کو محبوب حقیقی ایسا ہی صلہ عطا کرتے ہیں۔

راہ سلوک کے باسیوں کے لئے قدر اک روشنی ہے بے قدری اندھیرا ہے قدر کرنے والا انسان یا صوفی اپنے جسم جان میں باہر سے اندر سے پیدا ہونے والی وحشی خواہشوں کے مقابل اک ارادہ پیدا کرتا ہے اک قوت کی داغ بیل ڈالتا ہے جو تکمیل کو پہنچے تو بندہ رب سے عرض کرتا ہے۔

"میرے مالک میرے دل میں کوئی خواہش ہے نہ ہی کوئی تمنا۔ میں تجھ سے تجھ ہی کو مانگتا ہوں

مجھے اور کچھ بھی نہیں چاہیے مجھے دنیا کے ان نقشوں ان چیزوں اور ان کے پیچ و خم سے بچا کر اپنا بنا لے فرعونی سوچوں کا توڑ صرف اور ضربِ کلیمی رہیں اور تیرا پیار ہے یہ دونوں مجھے دان کر دے دنیا کے ہر دکھ سے مجھے انجان کر دے"

جب بار بار محبّ یہ دعا کرے تو اندر کا کاٹھ کباڑ دل سے نکل جاتا ہے۔ دل تو خود محب سے پکار پکار کر کہتا ہے

باہروں ہو کر بھاری چھڈ دے
سُٹ اندر دا کوڑا
رِجے کر تینوں یار بلاوے
بھن چھڈ جھودا چوڑا

دل ہی انسان کو قدر کرنے پر ابھارتا ہے یہ چھوٹا سا لوتھڑا انسانی جسم پر دماغ پر سوچوں پر اعمال پر افعال پر لین دین اور تنازعات پر حاوی ہوتا ہے اگر اس میں قدر کرنے والی صلاحیت در آئی تو جسم کا نظام درست ہو جاتا ہے اجسام درست ہو جائیں تو دنیا کا نظام درست ہو جائے ترقی یافتہ ممالک ترقی پذیر ملکوں کا خون چوسنا بند کر دیں گروزنی چیچنیا افغانستان شام اور عراق میں کٹے پھٹے اعضا اور جنگوں کی وجہ سے گل سڑ جانے والے جسموں کی سڑاند سے یہ خوبصورت زمین بچ جائے۔

قدر کرنے والے دل کی پاکیزگی پر زور دیتے ہیں دل کی طہارت پر مائل کرتے ہیں ہمارا سرمایہ صرف دل ہے اس کی قدر کرنا ہوگی اور یہی ہماری منزل ہے مگر ہم کیا کرتے ہیں؟ دل کو ظن و گمان میں مصروف کرتے ہیں یوں اپنے اوقات کو ان چیزوں میں ضائع کرتے ہیں جن میں ضائع نہیں کرنا تھا۔ دل کو پاکیزہ رکھنا ہوگا:

نہائے دھوئے کا بھیا، جو من میل نا جائے

من کی دنیا اور تن کی دنیا کا فرق سمجھنا ہوگا۔ دل کوئی ڈسٹ بن نہیں اس میں اعمال اور اخلاق کے جواہر بھرے ہوں تو یہ اک خزانہ ہے ایک خزانہ اللہ والوں کا دل ہے اس میں خالق کی محبت ہے بندہ اپنے مالک خالق کی پالنے والے کی پردہ پوشی کرنے والے رب کی چاہنے والے اللہ کی اپنے کریم مالک کی معاذ اللہ استغفر اللہ بے قدری کیوں کرتا ہے اس کا بڑا سبب دنیا کی محبت ہے مال کی محبت ہے پیسے کا لالچ ہے جس کے دل میں یہاں مزید رہنے کی خواہش ہے وہ کسی نا کسی درجے میں کسی نا کسی شکل میں دین کی نیکی کی علم و فضل کی بے قدری کا مرتکب ہو سکتا ہے اس دنیا کی عارضی رنگینیاں ہی ایسی ہیں کہ عموماً بندہ اس میں ڈوب کر رہ جاتا ہے اب قدر کون کرے گا جو دنیا کی محبت کو دل سے نکال سکے جو خود کو مسافر سمجھے جو خود کو حقیقی محبت والی راہ کا راہی سمجھے جو اپنی جیب سے مال خرچ کر کے دل ہی دل میں اپنے محبوب حقیقی سے کہے اے اللہ میں عرشِ الٰہی کی طرف نگاہ کر کے تجھ سے دل کی بات کہہ رہا ہوں جسے تو نے میرے کہنے سے پہلے ہی جان لیا ہے کہ میں تیرے رب ہونے پر اور سرکارؐ دو عالم کے سچے اور آخری رسول ہونے پر راضی یہ مساکین یہ قلاش لوگ یہ نادار یہ معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے لوگ میرے رشتے دار نہیں ہیں میں تو ان کے نام بھی نہیں جانتا مگر میں انھیں اپنی

جیب سے جتنا ہو سکے مال دے دیتا ہوں (یہ سچ ہے کہ میں یہ روپے اپنے پلّے سے نہیں دیتا تیرے دیئے ہوئے طیب رزق ہی سے دیتا ہوں) مگر میں صرف تیری قدر کرنا چاہتا ہوں میں تجھ پر جان و دل وارنا چاہتا ہوں میں اس بات سے ڈرتا ہی رہتا ہوں کہ مساکین کے لئے میری طرف سے کوئی ناز یبا بات نہ ہو سوالی کوئی ہو کیسا ہی کیوں نہ ہو اُسے جھڑکنا بڑی بے قدری ہوتی جن لوگوں کو اللہ نے اوپر والا ہاتھ عطا کیا اس میں اُنکی کسی خوبی تعلیم ڈگری یا میڈل کا کوئی حصہ نا تھا بس محض سچے مالک نے کرم کر دیا (تو اس سچے مالک کو سچا سا جن ہی بنا لیں) کوئی سوالی خود تو آپ کے در پر نہیں آتا اس کے دل میں اللہ بات ڈالتا ہے۔ میرے پیارو! آنے والے کو نہ دیکھنا بھیجنے والے کو دیکھنا جس مالک نے اتنے کرم کئے اس کا کوئی لحاظ ہی نا کریں کوئی دید ہی نہ ہو کوئی تواضع ہی نہ ہو تو خالق میرے بارے کیا سوچے گا کیا گمان کرے گا گو کہ وہ ہر سوچ سے ہر گمان سے وراء الورا ہے یہ سارے نظام شمسی اُس کی اک سوچ اک خیال سے ہی کن فیکون ہوئے جس روز اس کا ادھر سے خیال ہٹ گیا جس روز اس نے ہماری اس زمین سے اس کرۂ ارض سے اعراض کیا یہ سب کچھ ٹوٹ جائے گا ریزہ ریزہ ہو جائے گا لوگ اسے قیامت کہیں گے حالانکہ یہ صرف سچے مالک کا خیال اس کا دھیان ہٹ جانے کا شاخسانہ ہوگا۔

قدر کرنے والوں کو راتوں کو اُٹھ کر رونے والوں کو صدیقین کو شہدا کو صالحین کو اس نے محسنین کہا یہ کیسا کرم ہے (یعنی پنجابی میں یوں کہیں کہ بندے کو وڈیانے والی بات ہے) پیار کے سودے ہیں ان سے سودے بازی تو ہوتی نہیں صرف عطا ہی عطا ہے فضل ہی فضل ہے بندہ رب کے شایان شان قدر کر ہی نہیں سکتا یہ کیسا پرنول ہے! بندے نے قدر کی یاد کیا اپنایا اپنا بنا لیا تو خالق اپنی تجلیات میں سے اک ہلکا سا جھروکا بندے کے دل پر وا کر دیتا ہے بندے کی آنکھ کے سامنے سے اک پردہ ذرا سا سرکتا ہے تو وہ حیران و ششدر رہ جاتا ہے اتنی سی قدر کا اتنا بڑا انعام گندے مندے بندے نے یہ تو سوچا بھی نہ ہوگا۔

بے قدرا دل تنگ ہوتا ہے دل کی تنگی اور غفلت کا سب سے بڑا سبب دنیاوی محبت ہے ہمارے ہاں دیہات میں ایک ضرب المثل بولی جاتی ہے۔ درانتی کے ایک طرف تو کیلے کنگرے ہوتے ہیں دنیا کے دونوں طرف دندانے ہوتے ہیں اللہ والے اس دنیا میں رہ کر بھی آلودہ دنیا نہیں ہوتے دنیا کی بے ثباتی کا تصور ان کے ہاں بڑا گہرا ہوتا ہے دنیا کی چکی میں عموماً اپنے پرائے دونوں پاٹ پیس کر رکھ دیتے ہیں کوئی موٹا پسا کوئی باریک پس گیا واویلا مچانے سے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا جو پس گیا اس کی ہستی خاک ہوئی بھگت کبیر بنگال سے تعلق رکھتے تھے بڑے ہی محبت کرنے والے اور اللہ جل شانہ کے سچے دوست تھے فرماتے ہیں:

چلتی چکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے
دوے پٹ بھیتر آئے ثابت گیا نا کوئے

☆☆☆☆☆

گزارش

اقبال سے پہلے کی فارسی اور اس کے تتبع میں اردو شاعری مزاج، حال و احوال سے بنظر غور دیکھا جائے تو ایک ''شخص'' کی داستان ہے۔ ولی، میر، سودا، مصحفی، آتش، ناسخ، ذوق، مومن، غالب، داغ، امیر، اصغر، جگر اس کی شخصیت کے مختلف traits اور dimen'sion s ہیں۔ ایک ہی ''شخص'' اس سب میں بول رہا ہے۔ چونکہ اصل و نسل سے ایرانی ہے غالب کے persona میں فارسی آمیز بیان سے اوروں کی نسبت اپنا بہتر نمایندہ ہے۔ یہ ''شخص'' جو ہر عہد میں جوان ہے اور کسی پری ورش اور کافر ادا کا عشق زاد، قیس و فرہاد سے بڑھ کر صادق اس کی سوانح عمری میں رقیب روسیاہ، ناصح، واعظ، ندیم، نامہ بر کے کردار بھی ایکٹ کے کسی نہ کسی سین میں اپنا رول پلے کرتے نظر آتے رہتے ہیں۔ کوئی اس کے دکھ درد کو نہیں سمجھتا۔ معشوق رقیب کی طرف مائل اور رقیب بوالہوس۔ معشوق عشق و ہوس امتیاز نہیں کرسکتا۔ عاشق اپنی حالت زار پر خود روتا رہتا ہے۔

اے چشم رات دن تجھے رونے سے کام ہے
ملتے ہیں دونوں وقت ذرا تھم کہ شام ہے
اک دن فراق یار میں رویا میں اس قدر
چوتھے فلک پہ پہنچا تھا پانی کمر کمر
ہم رونے پہ آ جائیں تو دریا ہی بہا دیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا
یونہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویران ہو گئیں
طوفان نوح لانے سے اے چشم فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

.....

اس سچوئیشن میں ناصح اور نامہ بر کا جو معشوق کے قیامت مآب حسن سے آگاہ نہیں ایک خاص رول ہوتا ہے:

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

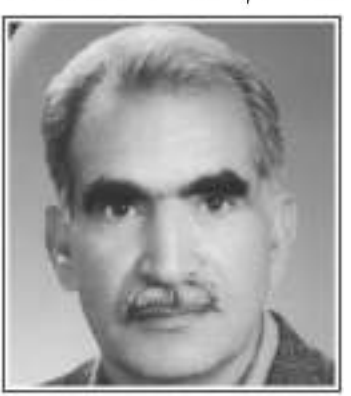

محمد ارشاد

نجات مل گئی ناصح سے عمر بھر کے لیے
اسی کو بھیج دیا یار کی خبر کے لیے

.....

جب ایسی شاعری کو ہی شاعری سمجھا جاتا چلا آیا ہو تو اس Climate of opinion میں کسی کو غالب اردو کا سب سے بڑا شاعر نہ لگے تو اور کیا لگے۔ وہ شاعر ناشاعر ہے جو نمازیوں کی:
جو جوتیاں چراتا ہے وہ بھی ہے آدمی

.....

کہتا ہے اور اس قحط زدہ کئی دنوں سے بھوکے کو سورج چاند ہر گول چیز دیکھ کر کہتا ہے:
بابا ہمیں تو سب نظر آتی ہیں روٹیاں

.....

پس جائے تعجب نہیں جو شعرا کے تذکروں میں ہمیں نظیر اکبر آبادی کا ذکر نہیں ملتا۔ چنانچہ اسی سلسلے میں معروف شاعر اور نقاد جناب جمیل یوسف کا خط بھی نظر سے گزرا۔ گویا
میں نے تو ایک بات کی اس نے کمال کر دیا

.....

بات غالب کے اس شعر:
ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
مری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

.....

کے حوالے سے یہ کی تھی کہ غالب نے سامنے کا قافیہ گریزاں چھوڑ کر نمایاں لے لیا۔ موصوف لکھتے ہیں ''گریزاں تو خود وہ چیز ہوتی ہے مطلوب و مقصود ہو۔'' معلوم نہیں گریزاں کا یہ مطلب انہوں نے کس لغت میں پڑھا۔ گریزاں کا مصدر گریختن (بھاگنا) ہے اور گریزد (بھاگتا) مضارع ہے اسی سے گریزاں (بھاگتا ہوا، بھاگ رہا ہوا) دویدن (دوڑنا) مصدر سے دور (دوڑتا) مضاع، دوراں (دوڑتا ہوا، دوڑ رہا ہوا) اسی طرح گریاں، خنداں، نالاں، رقصاں حالت کو ظاہر کر رہے ہیں۔ غالب نے اس شعر میں کہنا یہ چاہا ہے کہ جس رفتار سے منزل کی طرف میں بھاگ رہا ہوں اسی رفتار سے منزل مجھ سے دور بھاگ رہی ہے۔ ظاہر کہ بات منزل کی طرف بھاگنے کی ہو رہی ہے اور نہ پہنچ پانے کی، نہ کہ ''مجھ سے نمایاں'' ہونے کی۔ اگر شعر کا مطلب سمجھنے میں مجھ سے غلطی نہیں ہوئی تو گریزاں (بھاگنے کی حالت) سامنے کا قافیہ تھا نہ کہ نمایاں اور نمایاں کے ساتھ ردیف کے بغیر بھی پوری 'مجھ سے' بھی حشو ہے بحالیکہ دوسرے مصرعے کے قافیے کے ساتھ ایسا نہیں۔ پس دوسرے مصرعے کے الفاظ اور مفہوم کی رعایت کا پہلا مصرع یوں ہوتا:
بسکہ منزل ہے ہر گام گریزاں مجھ سے
مری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

.....

تو کیا مفہوم شعر واضح تر نہ ہو جاتا۔ مکتوب

نگار موصوف کا یہ کہنا ''یہاں تو غالب کی وجہ سے منزل دور ہوتی جا رہی ہے۔ غالب کی طوفاں خیز رفتار سے بیاباں آگے آگے بھاگ رہا ہے یعنی راستہ خود بھاگ رہا ہے اس لئے منزل دور ہوتی جا رہی ہے۔ یہ جو دوری ہے خود غالب کی وجہ سے نمایاں ہو رہی ہے نہ کہ منزل گریزاں ہے'' ان کے لیے اطمینان بخش ہو سکتا ہے اور ان کے ہم خیالوں کے لیے بھی۔ جب بات دوریٔ منزل کی اور نہ پہنچ پانے کی ہو رہی ہے تو گریزاں (بھاگتی ہوئی) اسی رفتار سے جس سے شاعر بھاگ رہا ہے تو نمایاں کا قافیہ گریزاں کے بہ نسبت برمحل کیسے ہو گیا؟ میری اس بات ''سامنے کا قافیہ گریزاں چھوڑ کر نمایاں لے لیا'' کا جواب یہ دیا ''ایک بڑا شاعر سامنے کی چیز تو نہیں اُٹھا لیتا۔''

شعر گوئی الگ چیز ہے اور شعر فہمی الگ چیز۔ سوال بڑے اور چھوٹے شاعر کا نہیں۔ بڑا شاعر بھی کوئی نہ کوئی لفظ بجا لانے کی غلطی کر سکتا ہے۔ بڑائی کسی غلطی کو توجہ دلانے پر تسلیم کر لینے میں ہے۔ خان زمان حاجی جان محمد قدسی شاہ جہان کے عہد میں ملک الشعرا تھے۔ ان کا یہ شعر:

ساقی بصبوحی قدرے پیشتر از صبح
بر خیز کہ تا صبح شدن تاب ندارم

.....

''کود کے می شنید و گفت صاحبا اگر بجائے قدرے نفسے گفتہ باشد برائے صبح مناسبت تمام دارد۔ حاجی قبول کرد و در جودت طبع آں کودک حیراں ماند و نفسے را بجائے قدرے می نوشت'' (کلمات الشعرا۔ محمد افضل سرخوش)۔

یعنی ایک بالک نے شعر سن کر کہا جناب اگر بجائے قدرے (کسی قدر) نفسے (دم بھر) کر دیا جائے تو یہ لفظ صبح سے مناسبتِ تمام رکھتا ہے تو ملک الشعرا نے یہ ''اصلاح'' یا صلاح نہ صرف قبول کی بلکہ بالک کی جودت پر حیران بھی ہوئے۔ یہ نہیں کہا کہ کل کل پنگھوڑے سے اترے ہو اور مجھ ملک الشعرا کو مشورہ دے رہے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ غالب کو اس کے محولہ شعر میں لفظ نمایاں کی بیجائی کی طرف متوجہ کرنے والا کوئی ہوتا تو نمایاں کے بجائے گریزاں قبول کر لیتے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اونٹ نہیں کودتے ان پر لدے بورے کودتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد غنی کشمیری اور غنیمت کنجاہی سے بڑے شاعر نہیں تھے ہر چند عنفوان شباب میں شعر کہتے رہے تھے۔ یہ شعر:

طاقتِ برخاستن در گردِ نمناکم نہ ماند
خلق می داند کہ مے خوردا ست و مست افتادہ است
(میری نمناک مٹی میں اُٹھنے کی طاقت نہ رہی اور لوگ جانتے ہیں کہ مے پی کر مست پڑا ہے)

جو غنی اور غنیمت دونوں کے ہاں موجود ہے، مولانا آزاد کے پسندیدہ اشعار میں سے ہے، مولانا نے رقم کرتے ہوئے لکھا کہ محل دانستن کا نہیں پنداشتن کا ہے۔ خلق می

داند کی بجائے پندارد ہونا چاہیے اور حق یہ ہے کہ حق با اوست۔ خلق پندارد (ساری دنیا یہ سمجھتی ہے کہ......)

خلق پندارد کہ مے خورد است و دست افتادہ است

……

شعر فہمی کی ایک مثال عربی ادب کی تاریخ میں بھی موجود ہے۔ شاعر خمر و مجون ابونواس کا گزر ایک مکتب کے پاس سے ہوا اور ایک طفل مکتب کو استاد سے ابونواس کے اس شعر:

الا فاسقنی خمراً و قل لی ھی الخمر
ولا تسقنی سراً اذا امکن الجہر

(ہاں تو مجھے شراب پلا اور یہ کہہ کر یہ شراب ہے اور چھپے چوری مت پلا جب بول پلا کر پلائی جا سکتی ہے)

کے بارے میں پوچھتے سنا کہ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ قل لی ھی الخمر شاعر نے کس وجہ سے کہا۔ استاد نے کہا، میں نہیں جانتا۔

لڑکے نے کہا کہ اس صورت حال میں چار حواس لذت یاب ہوتے ہیں، دیکھنے سے باصرہ چکھنے سے حس ذائقہ، جام پکڑتے لامسہ، رہ گئی سامعہ تو قل لی ھی الخمر سے وہ بھی لذت یاب ہو گئی۔ لڑکے نے شعر میں ترمیم نہیں کی، شعر کے مفہوم کی پرتیں کھول کر رکھ دیں جو خود ابونواس سے اوجھل تھیں۔ ابونواس نے کہا، بیٹا تو نے جو وضاحت میرے شعر کی کی ہے مجھ سے بھی نہ ہو پاتی صد آفریں۔

غالب کی اردو شاعری کا بیشتر حصہ ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است' پر عمل ہے۔ اسی لیے یہ دعویٰ کر دیا ہے:

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

……

حالانکہ نہ صوفی تھے نہ صاحب عرفان اسی لیے بیان کج مج ہو گیا:

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
مری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

……

اس شعر میں غالب نے کوئی نئی بات نہیں کی دوسروں کا آموختہ دہرایا ہے۔ بقول میر معز موسوی خان:

حق شناسی حیرت افزائے دل آگاہ شد
جادہ بالید آں قدر برخود کہ سدِ راہ شد

……

یہی بات غنیمت کنجاہی نے یوں کہی ہے:

نہ گردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدن ہا
کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدن ہا

ان سے پہلے ظہوری نے:

در آغازِ سلوک افتادہ راہ من بر آں وادی
کہ در ہر گام صد صحرائے بے انجام می روید

……

اور ان سے سالہا سال پہلے عارف کامل شیخ فریدالدین عطار نے:

صد قرن اگر گام زنی در رہِ او
چوں در نگری نخستیں گام بود

اس لیے کہ

کس بادیہ عشق بپایاں نہ رساند

وہ تمام قارئین جن کے ادبی ذوق کی تربیت اردو کے کلاسیکل شعرا بالخصوص غزل گو شعرا کے مطالعے سے ہوئی غالب کی مشکل پسندی، بآسانی سمجھ میں نہ آپانے کی وجہ سے غالب کو اردو کا سب سے بڑا شاعر گمان کرتے ہیں اور اسے ایسا گمان کرنا اپنے آپ کو اپنے ہی گمان میں ذہانت کا سرٹیفکیٹ عطا کرنا ہے۔ غالب بے شک بہت بڑا شاعر ہے سب سے بڑا اردو شاعر نہیں۔ میں غالب کے دو ایسے شعروں کی مثال دے سکتا ہوں جو ایک مضمون کے حامل ہیں ایک فارسی کا ہے اور ایک اردو کا:

مستم ز خونِ دل کہ دو چشمم ازاں پُر است
گوئی مخور شراب ندانی بجام چیست

حالانکہ ہے یہ ضربتِ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

.....

یہی مضمون میر تقی میر کے ہاں بھی موجود ہے:

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
چشم پُرخوں کی اک گلابی سے

.....

میر صاحب اپنا حال بیان کر رہے ہیں کسی دوسرے سے مخاطب نہیں ہیں خواہ کسی کو یہ حال معلوم ہو کہ نہ ہو۔ غالب کی طرح کسی کی بدگمانی دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اپنے شعر کو اپنے بارے میں ہمدردی نہیں چاہی نہ طعن سے کام لیا۔ غالب کا اردو شعر بیان کی وہ خوبی بھی نہیں رکھتا جو اس کے فارسی شعر میں ہے۔ خالی شیشہ، خارا (سخت ترین پتھر Granite) اپنی نزاکت کے باوصف چوٹ سے بجائے چور چور ہونے کے لالہ رنگ کیسے ہوگیا؟ میں غالب کے بڑا شاعر ہونے کا منکر بات کو سمجھنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔ یہ نہیں کہتا چونکہ کلام غالب کا ہے اس لیے ہر سقم اور عیب سے پاک ہے۔ اس بات سے کبھی خوف زدہ نہیں ہوا کہ مختلف سوچ اور رائے رکھنے سے ''خواص'' غبی اور بدذوق باور کرنے لگیں گے۔ تنہا رہ جانے کا مجھے کوئی خوف نہیں، وہ بھی اس Climate of Opinion میں جسے ہر قاری اپنی ادبی صحت کے لیے موافق سمجھتا ہے۔ غالب کا کوئی شعر سمجھ میں نہ آئے تو واہ واہ کرتا ہے اور نادانستہ اپنے آپ کو ذہانت کا اور خواص میں شامل ہونے کا اپنے آپ کو سرٹیفکیٹ بھی عطا کرتا رہتا ہے اور اعلیٰ ادبی ذوق کا مالک۔ کون ہے جس کو غالب کا یہ شعر یاد نہ ہو:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کا غالب یہ خیال اچھا ہے

.....

پوچھا جائے کہ جنت کی اصل حقیقت غالب

کے نزدیک کیا ہے۔ کیا اسی حقیقت کے بارے میں دل کے خوش رکھنے کی بات کی ہے یا اس جنت کے بارے میں کی ہے جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے جس کا ذکر سب کی زبان پر ہے پھر غالب کو کیا امتیاز حاصل ہوا لیکن، 'لیکن' اس سے تو یہ ظاہر ہے جنت کی حقیقت کچھ اور ہے جو غالب کو ہی معلوم ہے نہ کہ مجھے آپ کو۔ اگر ایسا ہی ہے تو نبی کی وحی پر شاعر کے الہام کو فوقیت حاصل ہوئی۔ غالب شناسی اور غالب فہمی کے مدعی جناب جمیل یوسف سے توقع ہے کہ رہنمائی فرمائیں گے اس امید کے ساتھ کہ حسب عادت و معمول کوئی ایسی تشریح و توضیح نہ کریں کہ مجھے یہ کہنا پڑ جائے:

پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

.....

اتنا بتا دوں کہ شعر کا مضمون بیدل سے مستعار ہے اور اس کا تعلق تصوف و عرفان ہے۔ مجھے غالب کے دعوئ ولایت پر کوئی اعتراض نہیں باعثِ تشویش "یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب، ہے۔ غالب کا یہ شعر بھی میرے لیے الجھن کا باعث ہے:

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

.....

آزادی میں آتش زیر پا رہے ہوں گے، اسیری تو محل عیش و آرام نہیں۔ وہ کوئی سیاسی قیدی تو تھے نہیں کہ کوٹھڑی میں شراب ملتی اور پکڑے جانے پر شہد میں تبدیل ہو جاتی۔ "اسیری میں بھی، آزادی ہی ہوتی اور کوٹھڑی کسی ہسپتال کا کمرہ فائیو سٹار ہوٹل کی طرح کا کمرہ ہوتی اسیری میں بھی؟ بھی کا لفظ بلاجواز اور برائے وزن بیت نہیں تو کیوں ہے۔ اور موئے آتش دیدہ کئی حلقوں یا کڑیوں میں بدل کر زنجیر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایک حلقہ زنجیر نہیں طوق ہوتا ہے یا پھر کسی اکٹھرے مویشی کی اگاڑی یا پچھاڑی۔ آتش زیر پا وہ ہوتا ہے جو گرم فرش پر ایک پاؤں رکھے اور برداشت نہ ہو تو دوسرا رکھ دے اور دایاں بایاں باری باری رکھتا رہے اور قرار کسی طور حاصل نہ ہو پائے۔ رہی بات آتش زیر پا کی ترکیب کے محل استعمال کی تو بیدل کے ہم عصر ناصر علی سرہندی کے یار محمد افضل سرخوش کے اس شعر سے اس کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے:

زبس سعیِ دگر ہر گام در راہِ فنا دارم
چو برق از گرمیٔ رفتار آتش زیر پا دارم

.....

اور موئے آتش دیدہ جو تپش سے حلقوں میں بدل کر چھوٹا ہو جاتا ہے اس مفہوم میں بیدل کے اس شعر میں ہے:

موئے آتش دیدہ را کوتاہ می باشد اجل
عمر ہا رفت و ہمیں امروز و فردا می رود

☆☆☆☆☆

امجد اسلام امجد (مرحوم) امجد کے بارے میں ایک تعزیتی اجلاس میں پڑھا گیا مضمون

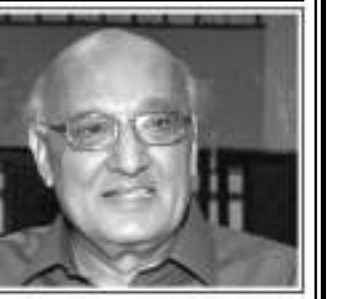

درست یاد نہیں پڑتا کہ امجد سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی۔ گمانِ غالب یہی ہے کہ یہ ملاقات انارکلی کے ایبک روڈ پر بشیر منذر کے مینار آرٹ پریس پر ہوئی تھی، جہاں دن بھر شاعروں اور ادیبوں کا ایک مجمع سا لگا رہتا تھا۔ اللہ کے فضل سے یہ پُرخلوص اور صمیمی دوستی پھر عزیز داری میں بدل گئی۔ امجد کی بیٹی روشین میری بہو اور میرا بیٹا محمد عاقب انور امجد کا داماد ہے۔ امجد کی نواسی اور میری پوتی زیبندہ کی ولادت پر میں نے امجد کو ٹیلیفون پر ایک مختصر سا جملہ خبر یہ کہا کہ امجد تمھیں مبارک ہو تم جدِّ امجد ہو گئے ہو۔

امجد کے ساتھ میں نے پاکستان اور بیرونِ پاکستان اتنے مشاعرے پڑھے ہیں، جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ امجد ایک نہایت ہمدرد دوست اور بہت ہی خوشگوار ہمسفر تھا۔ اُس کے ساتھ یہ تجربہ بہت ہی فرحت انگیز اور بشاشت آمیز ہوتا تھا۔ اُن کی ہمرہی میں سفر کی ساری صعوبت اور کوفت یکدم معدوم ہو جاتی تھی۔ اس لئے کہ جیسے ہر سال کی جنتری ہوتی ہے امجد کو ہر سال کے تازہ بتازہ اور نو بہ لطیفے ازبر ہوتے تھے۔

امجد کی ادبی تخلیقی صلاحیتیں اتنی کثیر الجہت، متنوع اور دامن دار ہیں کہ اُن کا مکمل احاطہ کرنا انتہائی دشوار ہے۔ ڈرامے کی صنف میں اُس نے جو کمال دکھایا ہے میں نے اُسکی جہدِ مسلسل کے بارے میں اُس کی زندگی میں کہا تھا۔

انور مسعود

کیسے ممکن ہے کہ رفعِ خستگی کے واسطے
دن کا وارث رات کی دہلیز پر بیٹھا رہے

.....

اس ضمن میں امجد کے بارے میں غلام محمد قاصر نے کتنا بلیغ مصرع کہا ہے:
چرخِ تمثیل پہ مہتابِ درخشاں ہے وہ نام

.....

جہاں تک امجد کی شاعری کا تعلق ہے وہ اُس کی سب سے زیادہ من بھاتی صنفِ سخن تھی۔ اس سلسلے میں اُس نے اپنے سامعین اور قارئین کا دائرہ محدود نہیں ہونے دیا۔ بزرگ بھی اُس کے مدّاح ہیں۔ نوجوان بھی اُس کی محبت بھری نظموں اور غزلوں کے متوالے ہیں اور بچّوں کو بھی اُس کے شعر ازبر ہیں۔ سامعین گرامی ٹالسٹائی کا قول ہے کہ کسی ادبی فن پارے کی اہمیت اس بات سے متعین ہوتی ہے کہ اُسے زیادہ سے زیادہ کتنے لوگوں نے سراہا ہے۔ امجد کی شاعری اس معیار کی پوری ترجمانی کرتی ہے۔ ضمیر جعفری صاحب نے تو امجد کی ہمہ گیر پہنائی فکر کو 'امجدستان' کا نام دیا ہے۔
بڑا آدمی وہ ہوتا ہے جس کے رخصت ہونے کے بعد اُس کی جگہ خالی رہے۔ امجد ایک ایسا ہی بڑا آدمی تھا۔ بڑے بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں نے اُس کی تخلیقات کی دلکشی کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔ اس فہرست میں فیض احمد فیض بھی ہیں۔ احمد ندیم قاسمی بھی، شہزاد احمد بھی، مشتاق احمد یوسفی بھی اور امجد کی منہ بولی بہن پروین شاکر بھی۔ عجیب اتفاق ہے کہ فیض احمد فیض صاحب اور اختر حسین جعفری صاحب نے ایک ہی لفظ کے وسیلے سے بڑا عمیق اور خوبصورت تبصرہ تجزیہ کیا ہے دونوں نے یہی کہا ہے کہ امجد بڑی سہولت سے لکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے یہ سہولت اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب شاعر کے صریرِ قلم میں نوائے سروش گھل مل جاتی ہے۔ سادہ لفظوں میں یوں کہیے کہ شاعر کی کاوش میں قدرت اپنا حصہ ڈال دیتی ہے۔
امجد کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر 'امجد فہمی' کے نام سے ڈاکٹر سید تقی عابدی کا ایک نادر ہدیہ تحسین ہے سات سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب بڑی محبت اور محنت سے لکھی گئی ہے۔ ڈیڑھ سو سے زیادہ صفحات پر مشاہیر کے ساتھ امجد کی تصویروں کا البم بھی اس میں شامل ہے۔
امجد نے اپنے دور کی ادبی تاریخ کو اپنے کالموں میں بڑی خوش اسلوبی سے قلمبند کر دیا ہے۔ اسے جدید فارسی کی اصطلاح میں

محافظ کاری کہتے ہیں۔ امجد نے یہ کام اس طرح سرانجام دیا ہے کہ غالب کا مصرع یاد آتا ہے:

ہر قدم راہروان است مرا

ایک مترجم کی حیثیت سے بھی امجد کے کارنامے انتہائی قابلِ تحسین ہیں۔ اُس کا مجموعہ عکس فلسطینیوں کے جذبہ حُریت اور اُن کے استحصال شکن رویئے کی بہترین ترجمانی ہے۔ ''کالے لوگوں کے روشن نظمیں'' سیہ فام لوگوں کا کرب انگیز نعرۂ حُریت ہے ۔ ان نظموں کے تراجم کا انتساب امجد نے کتنے روشن لفظوں سے کیا ہے۔ ''اُس لمحے کے نام جب حضرت بلال حبشیؓ نے کعبے کی چھت پر کھڑے ہو کر پہلی اذان دی تھی۔''

امجد کی حمدیہ، نعتیہ اور صنفِ سلام کی شاعری کے حوالے سے جناب فتح محمد ملک نے کیا عمدہ تبصرہ کیا ہے۔

''امجد کی تمناؤں کی کھیتی نسبتِ محمدیؐ سے ہری ہے''

امجد کے دریائے تحریر کی ساری موجوں کی روانی میں محبت کے پھیلاؤ کا ایک دلکش منظر دکھائی دیتا ہے یوں لگتا ہے کہ زمان و مکان کی ساری پہنائیاں محبت کے ایک لفظ کی گرفت میں ہیں۔ ایٹمی پھیلاؤ کے اِس دور میں محبت کے پھیلاؤ کی جو اہمیت ہے کوئی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

امجد ایک انتھک انسان تھا۔ اپنی آخری سانس تک وہ اس ارشاد باری پر عمل پیرا رہا ''ولیس للانسان الا ما سعیٰ''۔ اُس کی کتابوں کی تعداد بھی اُتنی ہے جتنے اُس کی عمر کے سال تھے ۔ اُناسی سالہ امجد اُناسی کتابوں کا مصنف تھا۔

اس دنیا سے جانے والوں کے لیے رونا بھی بیکار اور روئے بغیر رہنا بھی ناممکن۔

مسلسل اب تو آنکھوں میں نمی محسوس ہوتی ہے
بڑی شدت سے امجد کی کمی محسوس ہوتی ہے

امجد کی وفات پر لکھے ہوئے دو قطعات:

وہ ہم کو دے گیا داغِ جدائی
وہ خوشبو دار لفظوں کا لکھاری
کرشمے ہیں کئی اُسکے ہنر کے
ڈرامہ، شاعری ، کالم نگاری

زبانِ خلق دیتی ہے گواہی
وہ جنت کی طرف ہی تو گیا ہے
رہو چپ چاپ امجد کے سرہانے
ابھی کچھ لکھتے لکھتے سو گیا ہے

☆☆☆☆☆

''آلِ احمد کی بولتی، پرتولتی، رس گھولتی غزل''

سید آلِ احمد کی غزل رومانیت کے شعری دبستان سے ذہنی ہم آہنگی کے باوجود کشاکشِ زمانہ کا بھرپور شعور رکھتی ہے۔ بیسویں صدی کے آخری عشرے تک پہنچتے پہنچتے جن شعرا کے یہاں رومانیت اور روایت کی ملی جلی شکل کے ساتھ ساتھ فکر و اظہار کی جدت بھی نمایاں ہوئی' سید آلِ احمد کی غزل اس کی ایک مثال ہے۔ ان کی غزل میں غم و خوشی کی حالتیں، محبت اور معاش کی مختلف النوع صورتوں کے ادراک سے پیدا ہوتی ہیں۔ تاہم خود ان کی ذات میں درویشِ خدامست کی سی قناعت موجود ہے جو پھولوں کی سیج کا تمنائی ہوتے ہوئے بھی کانٹوں سے نباہ کرنا جانتا ہے۔ اس کا یہ رویہ ایک حقیقت پسند آدمی کا رویہ ہے جو خواب و خیال کے پیچھے بھٹکتا نہیں پھرتا، راستے کا پتھر بن کر بیٹھ جانے کو زندگی نہیں سمجھتا اور بے خبری کو نعمت نہیں جانتا اور جو فرار، تلون اور لایعنیت سے بھی گریزاں ہے بلکہ اس کے برعکس حوصلے' ہمت اور جرأت کے ساتھ بات کرتا نظر آتا ہے۔

سید آلِ احمد کی غزل رومانیت کے سچے اور کھرے اجزا سے مزین ہے۔ رومانیت پرانی اقدار اور روایات کی باغی ہوتی ہے، نیا اور منفرد تجربہ اس کی اساس قرار پاتا ہے۔ رومانیت فوری تجربے یا واردات کو بھی اہمیت دیتی ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی ناخوشگوار قسم کی ناآسودگی بھی تجربے کا

نجیب جمال

حصہ بن کر شعری اظہار میں نمایاں ہو جاتی ہے یا کیف و مستی کی مستقل حالت شاعری میں کھل کھیلنے کی ترغیب پیدا کر دیتی ہے۔ نتیجتاً شاعر بے باک ہوتا جاتا ہے اور پھر یہ مستی سنبھالے سے نہیں سنبھلتی تاہم اس بے لگام رومانیت کے مقابل سید آل احمد کی رومانیت سنبھلی ہوئی، متوازن اور بہت حد تک باشعور دکھائی دیتی ہے۔ ان کا لہجہ ہی منفرد اور مختلف نہیں' مفاہیم بھی بدلے ہوئے ہیں۔ دیکھیے:

ہنگامہ سرا مصر کا بازار نہیں اب
یوسف سا کوئی یارِ طرح دار نہیں اب
ہو بھی تو کوئی اس کا خریدار نہیں اب
دامانِ زلیخاں میں کوئی تار نہیں اب

.....

سید آل احمد کی رومانیت ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں یکساں ظاہر ہوتی ہے۔ بہاول پور کے قدیمی اور پُر رونق بازاروں میں ایک خوش پوشاک، وجیہہ و وسیم شخص شام ہونے سے ذرا پہلے نمودار ہوتا اور رات گئے لوٹتا۔ وہ ایک تازہ غزل کہتا اور اس غزل کو ان تجربوں سے سجاتا جو اس کے دن بھر کے کار لاحاصل کا پتہ دیتے۔ اس کی غزل پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا راستہ لوگوں کے ہجوم اور آوازوں کے ہنگام کے بیچ بناتا ہے اور جن لوگوں کے درمیان وہ رہتا ہے یا روز گزرتا ہے' وہ سب کے سب مجبور، بے کس اور غمِ روزگار کے ستائے ہوئے لوگ ہیں اور وہی لوگ اس کے مخاطب بھی ہیں جنھیں وہ وقت کے ظالم شکنجے میں کسے ہوئے کسی سہمے ہوئے طائر کی مانند دیکھتا ہے اور انھیں مرنے سے بچانا چاہتا ہے۔ یوں اس کا تخلیقی طرزِ احساس انسانیت کے بے پایاں جذبے سے جنم لیتا ہے۔ یہی چیز اسے گرم سفر رکھتی ہے اور اسے خلق و محبت کا قرینہ سکھاتی ہے اور یہی وہ مرحلہ ہے جب اس کی رومانیت میں انقلاب کی خواہش انگڑائی لے کر جاگتی ہے اور وہ خود بھی اس جدلیت کا حصہ نظر آنے لگتا ہے' جس میں محنت اور سرمائے کی کشمکش ایک مستقل ذہنی کیفیت کے طور پر شاعری کا تجربہ بنتی ہے۔

عام رومانی شعرا کے برعکس سید آل احمد کے یہاں طلبِ معاش کا مضمون غالب دکھائی دیتا ہے۔ وہ زندگی کی لطافتوں، رعنائیوں اور نزاکتوں کے بجائے کھردری اور بے کیف صداقتوں کو مدِنظر رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کاذب مراسموں کے دیار میں یقین کی صداقت کا ساتھ دینا دشوار ہوتا ہے مگر اسے بھروسہ ہے کہ ایسا کسی دن تو ہونا ہے یہ اس کا یقین ہی ہے جو کڑی دھوپ کی مسافت طے کراتا ہے اور مفلسی کے تسلسل اور ضرورتوں کے محیط میں بھی اسے سلیقۂ تزئینِ ذات عطا کرتا ہے۔ اس طرزِ احساس کو محض شاعرانہ یقین و اثبات کہہ دینا مناسب نہ ہوگا بلکہ اگر دیکھا جائے تو آل احمد کی کم و بیش تمام ہی غزلوں میں یقینِ

ذات کی کیفیت نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ بے یقینی، وہم، ابہام، لایعنیت، اجنبیت جو اس دور کے خاص مضامین ہیں ان سے آل احمد کو کچھ زیادہ نسبت دکھائی نہیں دیتی تاہم تنہائی کا مضمون ان کے یہاں بھی ملتا ہے اور آشوبِ زمانہ کی بہت سی جہتوں کو سامنے لاتا ہے۔

سید آل احمد کی بیش تر غزلوں میں صیغہ واحد متکلم کا استعمال نمایاں ہے۔ ان کی ایک نمائندہ غزل کا مطلع کچھ یوں ہے:

وقت کے طشت میں رکھا ہوا پتھر ہوں مَیں
حرف کا دشت ہوں، معنی کا سمندر ہوں مَیں

.....

اس غزل میں آلِ احمد کی تخلیقی شخصیت پوری طرح اُجاگر دکھائی دیتی ہے۔ یوں تو ہر شاعر کسی نہ کسی طور دعویٰ سخن کرتا دکھائی دیتا ہے اور اپنے تخلیقی اظہار کو مستند جانتا ہے۔ میر صاحب تو اس معاملے میں روایتی عجز و انکسار کو بھی خاطر میں نہ لائے تھے اور کہہ گئے ہیں کہ ع مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔ اس تعلی کا انھیں بجا طور پر حق بھی تھا۔ انھوں نے تو راوی کے انداز میں غزل کہہ کر ہم جیسے معتقدوں کی ترجمانی بھی خود ہی کر دی تھی:

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی

.....

میر پر تو تمام عمر خانہ نشینی کا الزام بھی رہا۔ سید آل احمد کو بھی میر جیسی صورتِ حال درپیش تھی۔ میرا اپنے عہد میں محبت، وفا اور مروت جیسی قدروں کی دہائی دیتے رہے اور آل احمد حفظِ مراتب کا کال پڑنے پر دل برداشتہ ہے:

شہر میں حفظِ مراتب کا بہت قحط ہے اب
آپ چاہیں تو چلے آئیں کہ گھر پر ہوں مَیں

.....

آیئے اس غزل کے کچھ اور اشعار بھی دیکھتے ہیں:

میری آواز کہاں اُس کو سنائی دے گی
گنبدِ صوت میں خود ایک تحیر ہوں مَیں
کون جانے کہ یہ خوش بو ہے عبارت مجھ سے
کیسے سمجھاؤں کہ پھولوں کا مقدر ہوں مَیں
مجھ کو آتا نہیں کاندھے پہ جنازہ رکھنا
منجمد شہرا حرارت کا پیمبر ہوں مَیں
آخرِ شب ہے، مری ذات سے نظریں نہ چرا
اے غمِ ہجرا ترے قد کے برابر ہوں میں

.....

مذکورہ پوری غزل میں سید آل احمد کا لہجہ اثباتِ ذات کرتا دکھائی دیتا ہے۔ شاعرانہ تعلی سے قطع نظر یہ اثبات محض شاعر کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ بعد ازاں عظمتِ انساں کے تصور پر محیط ہو جاتا ہے۔ گو اس لہجے میں صدا اور شکستِ صدا دونوں ملتے ہیں۔ مگر یہ شکستِ صدا بھی ذات کی شیرازہ بندی میں مصروف ہے اور آخرِ شب بھی غمِ ہجر کو چیلنج کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ ان اشعار میں صدا لگانے والا رائیگانی کے امکان کو اس لیے قبول کرتا ہے کہ وہ خود ابھی

عالمِ تحیر میں ہے اور اپنی تلاش میں ہے۔ خود پر اس کا اعتماد، یقین اور بھروسہ اس درجہ کا ہے جس کے احساس سے اس کا پورا وجود معطر رہتا ہے اور اس کے اندر حدت کا یہ عالم ہے کہ اس کی گرمی افکارِ تن مردہ میں حیاتِ نو کی روح پھونک سکتی ہے۔

آلِ احمد کی غزل کا لہجہ حرارت، قوت اور توانائی سے لبریز ہے۔ ان کی غزل میں اس لہجے نے دو طرح سے نمود پائی ہے: ایک تو یہ لہجہ اردو غزل کے روایتی حزینہ لہجے سے مختلف ہے اور اس میں بلند آہنگی کے باوجود تغزل کا سوز، گداز اور لوچ موجود ہے اور دوسرے اس لہجے میں مزاحمت، پیکار اور رجز کی سی کیفیت ملتی ہے تاہم یہ صرف نقارہ کی سی گونج پیدا نہیں کرتا بلکہ اس کی رسائی عقل و دل و نگاہ تک ہے۔

دیکھا یہ گیا ہے کہ بلند آہنگ شاعر عمومی طور پر لفظوں کو شکار کرتا ہے اور جتنا بڑا لفظ وہ شکار کرتا ہے بزعم خود اتنا ہی بڑا تعلّی کا مضمون باندھتا ہے۔ سید آلِ احمد کا تعلق شاعروں کے اس قبیلے سے ہے جو ذاتی تعلّی کے مضمون کو بھی شرف انسان کے تابع کر دیتے ہیں اور تخلیق کے لمحوں میں سنجیدگی سے معنی کی یافت کرتے ہیں۔ وہ دشتِ حرف کو بحرِ معنی سے سیراب کر دینے کا قرینہ خوب جانتے ہیں۔ ان کی شاعری ناکام و نامراد آرزوؤں کا جنازہ نہیں ہے بلکہ اس میں ایسی حرارت ہے جو منجمد ہوتے ہوئے وجود کو سکت، حرکت اور طاقت عطا کرتی ہے اور جو شبِ فراق سے مسلسل نبرد آزما ہو کر غمِ ہجر کے ماروں کو آخرِ شب نئے سویرے، نئے دن اور نئی امیدوں کی بشارت دیتی ہے۔ اس شاعری کا لہجہ توانا، قوی اور ولولہ انگیز ہے جس میں تخلیقی صداقت اور شاعرانہ خلوص دونوں موجود ہیں۔

سید آلِ احمد کے لہجے میں انا کا پھیلاؤ بھی خاصا معنی خیز ہے۔ اس معاملے میں بھی وہ دوسروں سے مختلف دکھائی دیتا ہے۔ اس کی ذات روز و شب کے حادثات سے ابھری ہے۔ اسے اپنی حدود کا بھی علم ہے اور اختیار کا بھی۔ وہ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے فریب کے نت نئے روپ کا شناور ہے۔ وہ جو بہ وقتِ ضرورت اپنی راکھ کو کرید کر چنگاری کو ہوا دے سکتا ہے اور جو عہدِ خزاں اور موسمِ ہجر میں روئیدگی پاتا ہے۔ اس کی انا زندگی کے امکانات کو ظاہر کرتی ہے۔ اسے پستی سے بلندی کی طرف لے جاتی ہے اور زیر و بم ممکنات کو ہویدا کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری نقشِ حادثات بھی ہے اور نقش گرِ حادثات بھی:

بہار آئے تو سر تا بہ پا برہنہ رہوں
عجیب پیڑ ہوں عہدِ خزاں میں پھیلتا ہوں

.....

ہیں اردگرد مرے نت نئے فریب کے روپ
نہ اس سے پہلے تھا تنہا نہ اب میں تنہا ہوں

.....

پتہ نہیں کہ کوئی شعلہ جاگتا مل جائے
میں اپنی راکھ کو خود آپ ہی کریدتا ہوں

نظر ملا کہ مرا حوصلہ جوان رہے
سکوتِ شہر! ترے سامنے کھڑا ہوں میں

جو شبِ تیرہ میں چمکتا ہے
میں وہ کردار کا ستارہ ہوں
شمعِ دل تو جلا کے دیکھ مجھے
تیری منزل کا سیدھا رستہ ہوں

مفلسی، بے نوائی اور بے زاری بھی آلِ احمد کی غزل کا مستقل مضمون ہے۔ جدید اردو غزل میں بطورِ خاص غمِ معاش کا تذکرہ ملتا ہے۔ اب شاید تصورِ جاناں کیے ہوئے بیٹھے رہنے کا زمانہ نہیں رہا۔ اب تو فیض صاحب کے لفظوں میں دلفریبیٔ روزگار کا زمانہ ہے جس میں شاعر کو زندہ رہنے کے لیے نہ صرف جتن کرنے پڑتے ہیں بلکہ اذیتوں بھرے راستے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اب تو ہر راستہ ڈر کا راستہ ہے۔ طلبِ معاش نے ان دیکھے اجنبی دیاروں کی راہ دکھائی ہے۔ گھر بنانے کی تمنا میں گھر سے ہجرت کرنا اور بے گھری کے عذاب سہنا مقدر ٹھہرا ہے۔

تمام جذبے زرد پڑ چکے ہیں - دھوپ سائبان بنی ہے اور راستوں میں تھکن بھری ہے - ایسے میں آلِ احمد بڑی معصومیت سے سوال کرتا ہے:

کون سی سمت میں ہجرت کا ارادہ باندھیں
کوئی بتلائے کہاں تازہ ہوا ملتی ہے

مگر جیسا کہ ان کی شاعری سے پتہ چلتا ہے آلِ احمد کے یہاں کرب، اذیت اور دکھوں کا مضمون زندگی کے ناگزیر حوالے کے طور پر ہے وگرنہ وہ زندگی سے محبت کرنے والا شاعر ہے۔ تھکن، خوف اور حبس سب اس کے نزدیک عارضی چیزیں ہیں اور زندگی کے تسلسل کو روک نہیں سکتیں بلکہ یہ سب زندگی کی بقا کی ضمانت ہیں۔ زندگی کے لیے تو فقط تبسم کے دیے روشن کرنا بھی بہت ہے اور آلِ احمد تو اتنا احیا پرست ہے کہ اسے یقین ہے کہ فصلِ گل نے بالآخر صحنِ چمن میں لوٹنا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں:

اور بڑھنے دو تھکن خوف نہ کھاؤ اس سے
شدتِ حبس سے تحریکِ بقا ملتی ہے

گھپ اندھیرے میں تبسم کا دیا روشن کریں
زندہ رہنے کی یہ اک صورت نظر آئی تو ہے
ہم یہ سمجھے تھے کہ آنکھیں زرد ہو جائیں گی اب
فصلِ گل صحنِ چمن میں لوٹ کر آئی تو ہے
دکھ تو ہم نے سہہ لیے اب دیکھیے آگے ہو کیا
انقلابِ صبحِ نو کی رہ گزر آئی تو ہے

سید آلِ احمد نے غزل کو فن اور فن کو زندگی بنایا۔ اور زندگی میں وہ زرد جذبوں اور اداسیوں کے موسم کا نہیں' معطر جذبوں اور

نشاطِ معتبر کے حامل دنوں کا سفیر ہے۔ وہ فن کو تہذیب کی بارش سے سینچتا ہے، انبساط لفظ و معنی سے سجاتا ہے اور دل کو گداز کر کے، سخن کو آب دے کر دل کی ردا کو روز ایک نئی غزل کہہ کر بھگوتا ہے۔ یوں آل احمد کی غزل بذاتِ خود زندگی، فن اور تہذیب کا تسلسل ہے۔ غزل کہنا آل احمد کے نزدیک کربِ مسلسل سے رہائی پانے کا عمل بھی ہے۔ یہ رہائی اسے آدھی رات گئے میسر آتی ہے جب سارے دن کی واردات اور تجربہ تخلیقی عمل کا حصہ بننے کو بے تاب ہو جاتا ہے۔ وہ کرب جو سارا دن اس کے جسم کو توڑتا ہے' آدھی رات کو وہ اسی سے طاقت لے کر غزل کہتا ہے اور امید کے جنگل کو ایک مرتبہ پھر ہرا کر لیتا ہے اسی لمحے وہ اپنی غزل میں سکوتِ شہر سے کلام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ شہر کی علامت اس کی غزل میں خصوصی معنویت رکھتی ہے۔ شب کی تاریکی میں جب سناٹا جاگتا ہے تو اسی لمحے آل احمد کی تخلیقی شخصیت انگڑائی لے کر بیدار ہوتی ہے۔ اس لمحے وہ شہر کے مجبور و مقہور لوگوں کی آہوں اور سسکیوں کو سنتا ہے' ان کے دروازوں پر فاقوں کی دستک کو محسوس کرتا ہے' چاروں طرف جان لیوا خوف کی آہٹ اس کے وجود پر بھی لرزہ طاری کر دیتی ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ جیسے شہرِ بے سکوں کی خموشی میں گھر اور باہر ایک جیسے بے اماں ہو گئے ہیں۔ اس پر وہ فقیہہِ شہر کو اس کی غفلت پر تنبیہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ ان دنوں کو یاد کرتا ہے جب ہوائے شہرِ طرب ایسی تھی کہ "لباسِ غم بھی بدن پر حسین لگتا تھا" تاہم اب شہر کی بے سکونی کے باوجود وہ اس بات پر مطمئن ہے کہ اس کی فکر اب نئی نسل کو منتقل ہو چکی ہے اور اس کی نظر نے جس طرح زمین کو شریانوں میں جاگتی زندگی اور ہر ذرے میں پوشیدہ آئینے کی صفت دیکھی تھی' اب کئی اہلِ نظر اور بھی موجود ہیں جو اس کے فن کے تسلسل کا ذریعہ بنیں گے اور جس طرح اس نے چپ کے ہونٹوں پر حروف اگا کر شہر کی پیاس بجھائی ہے اور خود پیاسا رہ کر سارے شہر کو سیراب کیا ہے اسی طرح اس جیسے کئی تشنہ کام اپنا ہنر آزمائیں گے۔ آل احمد کے لیے یہی بہت ہے کہ اس کے بھیگے ہوئے، معطر اور جاں فزا حروف اس کے اپنے لیے بھی تسکین کا باعث ہیں کہ وہ خود تو اندھی ساعتوں کی زمین پر مقیم رہا مگر حرفِ مدعا کو نشاطِ سراب عطا کر گیا۔

میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ تنہائی کا مضمون آل احمد کے یہاں آشوبِ زمانہ کی عطا ہے۔ ایک ایسے دور میں جب ہر شخص اپنی ذات میں تنہا ہے، آل احمد اس تنہائی کا مداوا چاہتا ہے۔ غزل اس کی تنہائی کی ساتھی ہے۔ جب وہ غزل کہتا ہے تو اس کے پس و پیش میں ایک مانوس فضا پیدا ہوتی ہے تاہم رفاقت کی تمنا ابھی اس کے دل میں باقی ہے۔ وہ رفاقت کے ایک لمحے کو بھی غنیمت جانتا ہے۔ وہ اگرچہ

تنہائی کے لمحوں میں ستاروں سے شناسائی پیدا کرسکتا ہے، اس کے لیے سرِ شام افق پر ایک ستارہ بھی بہت ہے اور یہی اس کی غزل کا ایک اور مثبت پہلو ہے۔

سید آل احمد ذہنی طور پر شاعری کی ترقی پسند روایت سے بھی قریب دکھائی دیتا ہے تاہم اس نے ترقی پسند شاعروں کی طرح گریبان کی دھجیوں کا شمار نہیں کیا اور نہ ہی کسی مرحلے پر آنچل کو پرچم بنانے کی بات کی ہے۔ آل احمد نے نہ تو انقلابی جدوجہد کی نہ کسانوں، مزدوروں اور محنت کشوں کے استحصال کو موضوع بناتے ہوئے ''بغاوت کا پرچم اڑاتے چلو'' کا نعرہ لگایا ہاں مگر ایک شعلۂ احساس اس کے ہر شعر میں موجود ہے۔ وہ اہلِ شعر پر اپنا دکھ ظاہر نہیں کرتا مگر جب شہر پر بے حسی طاری ہو جائے اور فکر و نظر میں انجماد پیدا ہو جائے تو وہ پوری شدت سے بولتا ہے۔ اسی لہجے اس کے سپاہیانہ اور جگردارانہ لہجے کا کس بل ظاہر ہوتا ہے۔ یوں تو اس لہجے کی نمود بیش تر غزلوں میں دکھائی دیتی ہے مگر یہاں ان کے ایک نمائندہ شعر کا حوالہ ناگزیر ہو جاتا ہے:

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا سوچتے ہو
شب کی شہ رگ پہ چھری رکھو سویرا ہو گا

.....

اردو غزل میں غم و شادی کی حالت اور اس کے اظہار کے متنوع قرینے دکھائی دیتے ہیں۔ خصوصاً کیفیتِ غم کی جو تصویریں اردو غزل میں ملتی ہیں اس کی مثالیں دوسری زبانوں کی شاعری میں کم کم ہی ملتی ہیں اور پھر اگر شاعر ایسا ہو جس کے یہاں غم کی گورائی پائی جاتی ہو اور جو حزن و الم کو زندگی کی لازمی حقیقت سمجھتا ہو وہ بھی اگر کبھی گھبرا کر مر جانے پر آمادہ ہو جائے تو اس کے لہجے کی شکستگی کا عالم کیسا ہو گا، اس پر عالمِ تنہائی کی یلغار کس شدت کی ہو گی اور روح کی پاتال کے دکھوں کو وہ کس طرح بیان کرے گا، یہ دیکھنے کے لیے آیئے سید آل احمد کے کچھ اشعار دیکھتے ہیں:

اب کہاں جائیں گے اے اجنبی چہروں کے دیار
ایک ہی گھر تھا بھرے شہر میں اب کیا ہو گا

آج وہ برسوں کا بیمار مسافر سا لگا
دکھ کوئی روح کی پاتال میں اترا ہو گا

.....

کہاں تک شانۂ ہستی یہ بارِ غم اُٹھائے گا
تری دنیا میں جینے کی ادا کس روز آئے گی

.....

کیسے اپنا دن گزرا، شب کیسے کٹی، کیا پوچھتے ہو
دن بھر خاک شہر اُڑائی، رات آنکھوں میں کاٹی ہے

.....

دن نکلتا ہے تو سورج کی طرح جلتا ہوں
شام ہوتی ہے تو دل ڈوبنے لگتا ہے مرا

.....

ہر شام اجڑ جاتے ہیں ہم
ہر روز سنورنا پڑتا ہے

روز کہتا ہوں اک غزل احمد
روز انگارے لب پہ رکھتا ہوں

آل احمد کے یہاں غزل کی کائنات کے سارے امکانات موجود ہیں - وہ زندہ احساس اور توانا جذبوں کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری تازہ واردات اور منفرد شعری تجربے کی حامل ہے۔ شاید اسی وجہ سے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ فوری واردات یا تجربے کے لیے وہ اس سے بہتر پیرایہ اختیار کرنے پر قادر ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے شعوری طور پر مضمون آفرینی اور اسلوب میں جدت اور انفرادیت پیدا کرنے کی خاطر اپنے اسلوب کی تراش خراش کو قدرے مختلف رکھا ہو۔ بنیادی طور پر وہ تجربے اور کیفیت کا شاعر ہے۔ یہی سبب ہے کہ تمثال آفرینی، رمز و کنایہ اور علامتی پیرایہ اس کے یہاں کم کم دکھائی دیتا ہے۔ وہ جنگل، دھوپ، دشت، صحرا جیسی بامعنی علامتیں استعمال کرتا ہے اور تسلیم کرتا ہے کہ تیشہ زنی کے ہنر پر حامل ہونے کے باوجود بار حروف اٹھا کر معنی کے رخ کو نکھارنے کی منزل ہنوز دور ہے:

ہے ابھی دوشِ معانی پر وہی بار حروف
ہنرِ تیشہ زنی آ تو گیا ہے مجھ کو

.....

جہاں تک مضمون آفرینی کا معاملہ ہے، آل احمد کے یہاں وہ سب مضامین یکجا ملتے ہیں جن سے انسان اور انسانی روایات و اقدار کا ناتہ بہت پرانا ہے۔ نارسائی، اپنی ذات میں تنہا ہونا، رفاقت کی ضرورت، آشوب آگہی، نشاط و غم، کیفیتِ حسن، معاملاتِ عشق، آئینۂ احساس، سنگِ ملامت، تلونِ مزاجی، عمر کی رایگانی، حرفِ مدعا، اول محبت کی ترنگ اور یادِ مراسم، انا کا پھیلاؤ اور دیوارِ انا کی خستگی، غموں کی شدت، جرمِ اخلاص، کاوشِ ہنر، حبس، گھٹن، خوف، اذیتیں، بے گانگی، بے مہری، وفا ناشناسی، کڑی دوپہر کی شدت، گھنے سائے کی طلب، انقلاباتِ دوروں، دوری کا بھید، رتجگے، ترکِ تعلقات، جنسِ وفا کی گرانی، فصلِ بہاراں کا زوال، خزاں کے نوحے، تقدیر پرستی، فریبِ آرزو، غمِ حیات کی تلخی، روح کے زخم، خاک بسری، کربِ مسلسل ..... ایسے مضامین ہیں جن سے ان کی غزل مزین ہے۔ ان سب حوالوں پر مبنی ایک بہت دلکش انتخاب آل احمد کے اشعار سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ کچھ اشعار دیکھیے:

میری آواز کہاں اس کو سنائی دے گی
گنبدِ صوت میں خود ایک تحیر ہوں میں

.....

مری تشنگی کا بھرم کیا رکھے گا
مجھے یہ سمندر تو صحرا لگے ہے
بس اک پل ٹھہر جائیے میری خاطر
رفاقت کا لمحہ بھلا سا لگے ہے

.....

وہ حبسِ لب بڑھا کہ بدن ڈولنے لگا
میں جب سکوتِ شہر کا در کھولنے لگا

اک خوف سا لگا مجھے خالی مکان سے
کل رات اپنے سائے سے دل ہولنے لگا

....

گونج سنتا ہوں خلا میں تو لرز جاتا ہوں
کس اذیت سے زمیں پر کوئی چیخا ہوگا

....

اول اول کیف زا معلوم ہوتا تھا مجھے
رفتہ رفتہ روح کا یہ زخم گہرا ہو گیا
ذہن سے جب واہموں کی دھوپ ڈھلنے لگ گئی
میرا سایہ میرے قد سے بھی زیادہ ہو گیا

....

بیتے ہوئے دنوں کے دکھوں کی ہوا بتا
کیا مجھ سے دور ہو کے تجھے کچھ سکوں ملا

....

بعدِ ترکِ تمنا بھی میلے رہے
شہر سونا ہوا کب خیالات کا

....

عمر بھر کون سا برسا ہے کرم کا بادل
گھر میں آتا ہے جو سیلاب بلا، آنے دو

....

میں جن کے رسم و روابط کا زخم خوردہ ہوں
وہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ آپ کیسے ہیں

....

منافقت کے قبیح چہروں کے نرم لہجوں سے ڈر گیا ہوں
میں ترش گفتار سچے یاروں کی صحبتوں کی تلاش میں ہوں

....

بدن اب تک تر و تازہ ہے، لیکن
سفر کی دھول آنکھوں میں جمی ہے

آلِ احمد نے غزل کو کاوشِ اظہار بنایا ہے۔ اس کے نزدیک غزل کا پیرایہ فقط خود کلامی کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ یہ شہر بھر کے لوگوں سے مکالمہ بھی کر سکتا ہے:

کاخِ جذبات کا در کھل تو سکتی ہے غزل
چپ کے اس دور میں کچھ بول تو سکتی ہے غزل
اتنے مایوس ہو کیوں شہر کے ماحول سے تم
حبس کتنا بھی ہو پر تول تو سکتی ہے غزل
تلخ اتنا تو نہیں ذائقہ صوت و حروف
ذہنِ ذی فہم میں رس گھول تو سکتی ہے غزل
اس کھڑی جھیل میں احمد کوئی پتھر پھینکو
کسی لہجے میں سہی بول تو سکتی ہے غزل

....

آلِ احمد اپنے دعویٰ میں سچا اور کھرا ثابت ہوا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب لوگ جان لیوا خوف سے مرے بیٹھے ہوں، موت کا سناٹا ہر طرف پھیلا ہوا اور حبس کا یہ عالم ہو کہ پرندے اپنے گھونسلوں میں گھٹ کر رہ گئے ہوں تو ایسے میں غزل ہی اذنِ کلام کا فریضہ انجام دے سکتی ہے، چپ کے سناٹے کو چیر سکتی ہے، سماعتوں میں رس گھول سکتی ہے اور نئے پرندوں کو پرواز عطا کر سکتی ہے آلِ احمد کی غزل کا تلخ و شیریں لہجہ ذہنوں کو صوت و حرف و معنی کی ضرورت کا احساس دلاتا ہے۔ اس نے کھڑے پانیوں کی جھیل میں غزل کی صورت پتھر پھینک کر ارتعاش پیدا کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

کہاں رکھے ہیں وہ لمحات میں نے

[جناب شہزاد احمد کی سال گرہ پر خصوصی تحریر]

گزرنے ہی نہ دی وہ رات مَیں نے
گھڑی پر رکھ دیا تھا ہات میں نے
شہزاد احمد

گھڑی پر ہاتھ رکھنے سے گزرتا وقت تھم سکتا تو زندگی کے خوب صورت پلوں کو کون جانے دیتا؟ مگر وقت ظالم رُکتا کہاں ہے! کسی کے لیے بھی تو نہیں رُکتا یہ۔ سرپٹ بھاگتا چلا جاتا ہے۔ گاڑی کے اندر بیٹھے مسافروں کو سرِ راہگزر ایستادہ پیڑوں کا منظر بھاگتا دکھائی دیتا ہے اور پیڑوں پر بیٹھے پرندوں کو وہ مسافر۔ مجھے تو لگتا ہے کہ نہ اندر والے مسافر بھاگ رہے ہوتے ہیں اور نہ ہی باہر کا منظر۔ اندر باہر حقیقت میں اگر کوئی بھاگ رہا ہوتا ہے تو وہ ہے وقت۔ اس کی گرفت سے کوئی سمت، کوئی رُخ آزاد نہیں۔ اس کا سفر جاری رہتا ہے۔ وقت ہمیشہ رواں دواں رہنے والی حقیقت یا تصور جسے ہم بس یادوں ہی کی صورت میں روک سکتے ہیں۔ چاہے تھوڑی دیر ہی کے لیے--- بیتے لمحوں کی سلائیڈز کو پراجیکٹر پر دیکھتے ہوئے، ایک ایک کرکے، آہستہ آہستہ، منظر منظر--- زندگی کے مناظر کے عکس انسان کو کتنے ہی چہرے دکھاتے چلے جاتے ہیں اور محبت سے دیکھنے والے کو ہر خوب صورت عکس میں اپنا ہی چہرہ دکھائی دیتا ہے جسے وہ آنکھوں سے لگانا چاہتا ہے:

حامد یزدانی

اپنی تصویر کو آنکھوں سے لگاتا کیا ہے
اک نظر میری طرف بھی، ترا جاتا کیا ہے
شہزاد احمد

نظر نظر مسکراتا ایک روشن چہرہ شہزاد احمد صاحب کا بھی ہے۔ شاعر، ادیب اور مترجم۔ ایک عہد کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے اپنا گرویدہ بنا لینے والے شہزاد صاحب جن کی شاعری سے تعارف تو لڑکپن سے بھی کچھ پہلے ہو چکا تھا۔ والدِ گرامی جناب یزدانی جالندھری کے نام تمام ہی ادبی جرائد بہ شمول فنون، اوراق، ادبِ لطیف، بیسویں صدی، افکار، نقوش، تخلیق، محفل، شام و سحر، اردو ادب اور دیگر گھر پر آتے تھے۔ سو، ورق گردانی کی حد تک ادبی جرائد اور ان کے مندرجات سے تعارف تبھی ہو گیا تھا۔ بعد ازاں جب اسّی کے اوائل میں شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز کیا تو کتنے ہی اہم اور عظیم شعرا سے بالمشافہ شرف ملاقات حاصل ہوا۔ ان میں جناب احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، عارف عبدالمتین، خالد احمد اور شہزاد احمد کی شخصیت اور فن کا تاثر انتہائی گہرا رہا۔

شہزاد صاحب کو ہم نے دیکھا بھی اور انہیں سُنا بھی۔ اُن کے ساتھ لاہور اور بیرونِ لاہور کئی مشاعرے بھی پڑھے۔ وہ بڑے دلآویز انداز میں اپنا کلام سناتے تھے۔ وہ غزل سنا رہے ہوتے یا نظم آغاز کر رہے ہوتے۔ میں، خالد علیم، عباس تابش، علی اصغر عباس، ناہید شاہد، جاوید انور، اعجاز رضوی، انجم سلیمی، طارق کامران، اصغر عابد یعنی ہم سب سراپا چشم و گوش بن کر انہیں دیکھا، سنا کرتے:

کیا فقط دیکھتے رہنے سے مسائل کی گرہ کھلتی ہے
کیا فقط آنکھ کی پتلی میں ہے محفوظ خدائی ساری
ہم کہ انسان نہیں آنکھیں ہیں

.....

وہ انتہائی ذہین شاعر اور ایک زیرک ادیب تھے۔ ان کا قلم نظم و نثر دونوں میں رواں تھا۔ امریکی ماہر عمرانیات ایلون ٹافلر کی تحریروں سمیت ان کیا کثر تراجم کو بھی ادبی حلقوں میں خاصی پزیرائی حاصل ہوئی۔ اُن کی تخلیقی شخصیت کا ایک دل چسپ رُخ بھی تھا کہ وہ ادب، فلسفہ اور سائنس کو ملا کر دیکھتے تھے۔ مجھے یاد کہ ریڈیو ڈوئچے ویلے (دی وائس آف جرمنی) کی اردو نشریات کے لیے میں نے ان سے ایک خصوصی بات چیت غالبؔ کے فن کے حوالے سے بھی ریکارڈ کی تھی جس میں انہوں نے اس عظیم شاعر کے اشعار میں سائنسی گوشوں پر اظہارِ خیال کیا اور غالب کو سائنسی اصولوں کا عالم قرار دیا۔

شہزاد صاحب کا شمار پاکستان کے ان چند ممتاز شعرا میں ہوتا تھا جو بزرگ اور نوجوان لکھاریوں میں یکساں مقبول تھے۔ نوجوان

لکھاریوں کی حوصلہ افزائی میں پیش پیش رہتے تھے۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے میرے متعدد ہم قلم دوستوں کے علاوہ میرے پہلے مجموعہ 'ابھی اک خواب رہتا ہے' کا فلیپ بھی تحریر کیا اور اس کتاب کی دو تقریبات کی بھی صدارت فرمائی۔

بہت سے نئے لکھنے والے ان سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ والدِ گرامی حضرت یزدانی جالندھری صاحب کی برسی کی خصوصی تقریب کی دعوت دینے کے لیے جب اسرار ورائچ اور میں شہزاد صاحب کے گھر پہنچے تو انہوں نے بہت تپاک سے ملے۔ ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور پھر مسکراتے ہوئے بولے: 'نوجوانو! اگر تو تم لوگ اپنی شاعری سنانے آئے ہو تو میں تمہیں پہلے ہی بتا دوں کہ ابھی ابھی ایک نوجوان شاعر مجھے اپنی اتنی طویل نظم سنا کر گیا ہے کہ میرا شاعری سننے کا آج کا کوٹہ پورا ہو چکا ہے'۔ یہ کہہ کر ایک زندہ دل قہقہہ بلند کیا۔ شہزاد صاحب کو جاننے والے ان کی آنکھوں اور لہجے سے چھلکتی شرارت کو خوب سمجھتے تھے اور اس سے خوب محظوظ ہوتے تھے۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں میرے استاد، ماہرِ اقبالیات پروفیسر مرزا محمد منور صاحب شہزاد احمد کی حاضر جوابی اور برجستگی کی بات کرتے ہوئے یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ جن دنوں خوش فکر اور خوب رو شہزاد احمد گورنمنٹ کالج میں زیرِ تعلیم تھے یہاں پروفیسر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم صاحب کی شاعری اور شخصیت کی بھی دھوم تھی اور یہ کہ شہزاد اپنے جملہ محاسن کی بدولت، صوفی صاحب کے حلقہ نیازمندان میں نہ صرف شامل تھے بلکہ ان کے منظورِ نظر تھے اور ان سے بہت بے تکلف تھے۔ کم و بیش ہر روز ملنے آتے۔ ایک روز آئے تو ناک پر نظر کی عینک لگا رکھی تھی۔ صوفی صاحب کو شہزاد کے چہرے پر عینک ایک آنکھ نہ بھائی۔ دیکھتے ہی بولے: 'شہزاد! یہ تم نے عینک کیوں لگا رکھی ہے؟'

شہزاد بولے: ''ٹھیک سے نظر نہیں آتا تھا سو ڈاکٹر نے عینک لگانے کا مشورہ دیا تھا۔''

صوفی صاحب کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر بولے: ''شہزاد! عینک اتار دو۔ اسے لگا کر تم بالکل بندر دکھائی دیتے ہو۔''

شہزاد جھٹ بولے: ''کیا کروں صوفی صاحب! اگر اتار دوں تو آپ بندر دکھائی دیتے ہیں۔''

انجم سلیمی جب حلقہ ارباب ذوق فیصل آباد کے سیکرٹری منتخب ہوئے ان دنوں ہمارے عزیز دوست مختار حسین کھرل بھی وہیں تھے، سو حلقہ نے کئی نہایت کامیاب پروگرام منعقد کیے جن میں فیصل آباد کے ساتھ ساتھ لاہور کے شاعر ادیب بھی شریک ہوئے۔ یہ شاید حلقہ کے سالانہ جلسے کی بات ہے۔ پاک ٹی ہاؤس لاہور سے نوجوان اور

بزرگ لکھاریوں کی بس بھر کر فیصل آباد روانہ ہوئی۔ اس ادبی کروز میں اسرار زیدی، الطاف قریشی، یونس جاوید، زبیر رانا، شہزاد احمد، یونس علی دلشاد اور رشید مصباح جیسے تخلیق کار شامل تھے۔ بس نے جیسے ہی شاہدرہ پار کیا لکھاریوں میں ایک دل چسپ بحث آغاز ہوگئی۔ بحث کا محرک کون تھا یہ تو یاد نہیں تاہم یہ ضرور یاد ہے کہ اس میں سب سے زیادہ متحرک رشید مصباح تھے۔ جنھوں نے گرما گرم دلائل دیتے ہوئے پہلے اپنے سوٹ کی ٹائی ڈھیلی کی، کچھ دور نکلے تو ٹائی نکال ہی دی، بحث میں اور شدت آئی تو انہوں نے اپنا کوٹ اتار دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ نیچے پہنی اپنی واسکٹ اتارتے شہزاد صاحب پیچھے مڑے اور یوں چہکے:

''رشید مصباح! یہ بحث کہاں پہنچے گی ہم نہیں جانتے لیکن یہ ضرور جان گئے ہیں کہ اگر تم اسی رفتار سے کپڑے اتارتے رہے تو جلسہ گاہ کس لباس میں پہنچو گے!''

بس میں ایسا زبردست قہقہہ بلند ہوا کہ بحث کی کدورت بھری ساری گرد یک دم بیٹھ گئی۔

۱۹۸۷ء میں حلقہ ارباب ذوق لاہور کی سالانہ تقریب اس لحاظ سے بہت اہم تھی کہ اس میں (مارشل لا کے خاتمے کے باعث بائیں بازو کے) کئی نامور تخلیق کار مدت بعد شریک ہوئے تھے۔ فلیٹیز ہوٹل میں منعقدہ اس تقریب کے پہلے دور میں 'ادیب کی سماجی ذمہ داریاں' کے موضوع پر مقالے پڑھے گئے جبکہ دوسرا دور مشاعرہ پر مشتمل تھا جس کی صدارت شہزاد احمد کر رہے تھے۔ اکادمی ادبیات کیا اس وقت کے چیئرمین پریشان خٹک مہمانِ خاص تھے۔ مشاعرہ میں ظہیر کاشمیری، اسرار زیدی، انجم رومانی، اکبر کاظمی، خالد احمد، نجیب احمد، سراج منیر، ایوب خاور، سلیم طاہر، علی اکبر عباس، جعفر بلوچ اور محمد خالد سمیت متعدد اچھے شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ میں سٹیج پر شہزاد صاحب کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا تھا کیونکہ اس تقریب میں حلقہ کے 'انتقالِ اقتدار' کی رسم بھی ادا ہونا تھی جس میں رخصت ہونے والی انتظامیہ (رشید مصباح اور اظہر غوری) نے حلقہ کی نئی انتظامیہ (سیف زلفی اور حامد یزدانی) کو اختیارات سونپنا تھے۔ مشاعرہ کے اختتام پر مہمانِ خاص کو دعوت خطاب دی گئی جس میں انہوں نے مشاعرہ میں پیش کی جانے والی شعری تخلیقات کو قومی جذبہ سے عاری بے معنی قرار دیا۔ شہزاد صاحب نے میرے اور قریب ہوتے ہوئے پنجابی میں سرگوشی کی: 'ہور چوپو!'۔ میں نے اشارتاً کہا کہ انہیں رشید مصباح نے خاص طور سے مدعو کیا ہے۔ بہرحال پھر شہزاد صاحب نے بھی صدارتی کلام پیش کیا جو واقعی معنی خیز تھا:

سب کی طرح تو نے بھی مرے عیب نکالے
تو نے بھی خدایا مری نیت نہیں دیکھی

.....

نیند آئے تو اچانک تری آہٹ سن لوں
جاگ اٹھوں تو بدن سے تری خوشبو آئے

.....

ایک دفعہ والد صاحب اور شہزاد صاحب کے ساتھ مشاعرہ میں شرکت کے لیے جڑانوالہ کا سفر کرنا پڑا۔ راستہ بھر مصرعۂ طرح پر طبع آزمائی ہوتی رہی۔ سردیوں کے دن تھے۔ میں نے سفر میں کالج کا میرون بلیزر پہن رکھا تھا۔ شہزاد صاحب نے مسکرا کر استفسار کیا: ''کیوں حامد، تم مشاعرہ پڑھنے جا رہے ہو یا کلاس پڑھنے؟''
پھر فوری بولے: 'میں بھی گورنمنٹ کالج کا بلیزر بڑے شوق سے پہنا کرتا تھا'۔
جڑانوالہ کے ٹاؤن ہال میں منعقدہ اس مشاعرہ میں وزیر آغا اور سرگودھا سے ان کے حلقہ احباب کی کثیر تعداد شامل تھی اور ان میں شہزاد احمد کی مقبولیت دیکھتے ہوئے یہ بات سمجھنا مشکل نہ تھا کہ شہزاد صاحب نے خود کو ادبی گروہ بندی سے دور رکھا ہے۔
شہزاد صاحب کا ایک اعزاز یہ بھی تھا کہ انہوں نے نبیٔ آخر الزماں کی بھی مدح سرائی کی اور ان کی آل کی بھی۔ حرمین شریفین کے سفر کی ترجمان ان کی یہ آزاد نظم ان کے دلی جذبات کی بھرپور عکاسی کرتی ہے:

عجیب قریہ ہے
جس کی خوشبو سے سارا عالم مہک رہا ہے
عجیب بستی ہے
جس کی باتوں سے اک زمانہ چہک رہا ہے
عجیب سی روشنی مکانوں سے آ رہی ہے
عجیب تابندگی بہر سمت چھا رہی ہے

.....

نعت کے یہ اشعار بھی انتہائی خوب صورت انداز میں آقائے نامدار سے شہزاد احمد کی محبت کا اعلان کرتے ہیں:

آنکھوں میں نور دل میں بصیرت ہے آپ سے
میں خود تو کچھ نہیں مری قیمت ہے آپ سے

ہے آپ کا کرم یہ مری خواہش نمو
گو خاک ہوں مگر مجھے نسبت ہے آپ سے

یہ آپ ہی کا فیض دلوں کا گداز ہے
ان برف کی تہوں میں حرارت ہے آپ سے

.....

اپریل شہزاد احمد کی سالگرہ کا مہینہ ہے۔ بہار کا مہینہ اور ادھر میں کینیڈا شمالی امریکا کی برف برف تہوں میں یادوں کے خیالی گلاب تلاش کرنے میں کوشاں ہوں۔ یادوں کے گلاب جو بیتے لمحات کی طرح ذہن سے آنکھ مچولی کھیلتے رہتے ہیں۔ ابھی ملے اور ابھی پھر کھو گئے۔ ایسا لگتا ہے جیسے شہزاد احمد آہستہ آہستہ کہہ رہے ہوں:

بڑی مشکل سے ہاتھ آئے تھے شہزاد
کہاں رکھے ہیں وہ لمحات مَیں نے

☆☆☆☆☆

اختر حسین جعفری کا اسلوبِ اظہار

امیر حسین جعفری

رسالہ فنون کے تاثرات کے گوشے میں محترمہ منصورہ احمد کی نظم بعنوان مجھے رستہ نہیں ملتا پر اپنا تاثر رقم کرتے ہوئے معروف شاعر اور نقاد جناب غافر شہزاد فرماتے ہیں کہ منصورہ احمد اپنی نظم اس سطر سے آغاز کرتی ہیں مجھے رستہ نہیں ملتا منصورہ احمد کے قریب کھڑا دوسرا شخص بھی یہی کہتا کہ مجھے رستہ نہیں ملتا یہی سطر جب ان کے قریب کھڑے تیسرے شخص اختر حسین جعفری تک پہنچتی ہے تو وہ کہتا ہے۔

سرشک خوں رخ مضموں پہ چلتا ہے تو اک رستہ نکلتا ہے:

ندی دریا پہ تھم جائے
لہو نقطے پہ جم جائے
تو عنوان سفر ٹھہرے
اسی رستے پہ سرکش روشنی تاروں میں ڈھلتی ہے
اسی نقطے کی سولی پر پیمبر بات کرتے ہیں
ان کوٹ

یہی وہ نقطہ ہے جس کی سولی پر پیمبر بات کرتے اور یہی وہ نقطہ ہے جو جناب اختر حسین جعفری صاحب کی شاعری میں موجود، بنیادی فکر کی کلید تربیت یافتہ قاری اور صاحب بصیرت نقاد کے ہاتھ میں تھماتا ہے۔

جناب اختر حسین جعفری اپنے اولیں مجموعہ کلام آئینہ خانہ کے پیش لفظ زمیں کا اولیں مکتوب میں اسی نقطے کی شرح اس طرح بیان کرتے ہیں

بادلوں کے نام زمیں کا یہ مکتوب ان دعاؤں، التجاؤں، شکایتوں اور حکایتوں پر مشتمل ہے زمین جسے ہوا ستارے، پھول، لحہ لحہ سوکھتے ہوئے سمندر، پھٹے بادبان، خالی مکان، پیوندلگی چادر، طلوع ہوتے ہوئے آفتاب اور گہنائے ہوئے مہتاب سے لکھواتی ہے اور انہی نامہ بروں سے جواب میں تاخیر پر گلہ مند بھی ہوتی ہے۔ ہوا کی ایک اپنی زبان ہوتی ہے۔ ستارہ اپنا استعارہ خود وضع کرتا ہے۔ پھول کے سات رنگ اپنی علامتیں خود معین کرتے ہیں تاکہ دھنک کی چھایا کو اظہار میں آسانی رہے اور بہار تازہ اپنی مہکار کو نغمگی پہنا سکے۔ لحہ لحہ سوکھتا ہوا سمندر اپنے عدد کی لکیر خود کھینچتا ہے کہ قرن قرن سے تنگ ہوتے زمینی دائرے کو کچھ اور جگہ مل سکے، کچھ اور مکان تعمیر ہو سکیں وہ مکان جنہیں بالآخر اپنے مکینوں سے محروم اور اپنی مضبوط بنیادوں کے باوجود منہدم ہونا پڑتا ہے۔ پھٹے ہوئے بادبان کا روزن قضا و قدر کا مفہوم خوب سمجھتا ہے اور پیوندلگی چادر نے ہر عہد میں نو بہ نو لغت تخلیق کی ہے جس کے واضح ابلاغ سے طلوع ہوتے ہوئے آفتاب نے اور گہنائے ہوئے آفتاب نے ہمیشہ پہلوتہی اختیار کی اس لیے کہ آفتاب اور مہتاب کے آئینے صرف وہی تصویریں وہی اشکال اور وہی چہرے دکھاتے ہیں، انہی اعداد کی تفہیم کراتے ہیں، جنہیں کورچشم دیکھنا اور سمجھنا چاہیں ------ اور زمین پر صلیب کی صورت وہی میزان گڑی ہے جس کے پلڑے ہر راست فکر کی عمودی قوت کے منکر ہیں۔ اسی میزان کے پلڑے میں انسان ایک یرغمالی کی صورت زندہ اپنی رہائی کی قیمت پوچھ رہا ہے۔ ان کوٹ

اس عمودی فکر کے استرداد کے نتیجے میں جناب اختر حسین جعفری نہ صرف سولی کو علامت بنا کر نوع انسانی کے ازلی استحصال کی شعری تمثیل بیان کرتے ہیں بلکہ اس شعری تمثیل سے قبل مزاحمت کا علم اس طرح بلند کرتے ہیں۔ کوٹ

راہبوں نے کہا: لوگو! یہ شخص جس کے ہنرمند ہاتھ شب الزام خالی آسمان کی طناب سے باندھے گئے اس کے اور زمین کے درمیان کوئی بھید تھا اور اب یہ زائر لے نہ رک سکیں گے اور منقسم آفاق سے تازہ ہجرتوں کے چاند پھر طلوع ہوں گے، لوگو! اس نے اتنا ہی تو کہا تھا کہ مناجات کی رات اگر روشن الاؤ کے گرد سنگ آوارہ منڈلانے لگے تو خشک لکڑی الاؤ پر پھینکنے کے بجائے بے ادب کتے پر پھینکو۔ ان کوٹ

جس نقطے کی سولی پر پیمبر بات کرتے ہیں اس نقطے کی شرح و تعبیر جناب اختر حسین جعفری نظم سولی سے عیسیٰ اترے میں اس انداز سے کرتے ہیں

سولی سے عیسیٰ اترے تو تیز ہوا کا زور تھمے
قاتل ہاتھوں کا زخم بھرے

عہد ہمارا، عہد ملامت، عہد خجالت
ایک اپاہج کی بیساکھی کتنے لنگڑوں کے کام آئے گی
ہم سب لنگڑے اور اپاہج، سب کے جسموں پر ناسور ہیں اور اس کے اعجاز کا مرہم

ہمارا مقدار ہے، صبر طلب ہے اور گراں ہے
مریم جس کے بال کھلے ہیں
کب تک وہ ماں اپنے پسر کے حرف دعا کا پیش
عدالت ورد کرے گی
سحر ملامت کب ٹوٹے گا
تخت سے عیسیٰ کب اترے گا
سولی سے عیسیٰ اترا تو گردن خم تھی
سولی سے عیسیٰ اترا تو اپنی خبر، اپنے الہام سے
شرمندہ تھا

ان کوٹ

اور مناجات کی رات الاؤ کے گرد بیٹھے عبادت گزار سولی سے اترے عیسیٰ کی خبر اور الہام کی شرمندگی کا اظہار نوحہ کی صورت یوں کرتے ہیں کہ

اب نہیں ہوتیں دعائیں مستجاب
اب کسی ابجد سے زندان ستم کھلتے نہیں
سبز سجادوں پہ بیٹھی بیبیوں نے
جس قدر حرف عبادت یاد تھے پوچھے تک
انگلیوں پر گن لئے
اور دیکھا ------ رحل کے نیچے لہو ہے
شیشۂ محفوظ کی مٹی ہے سرخ
سطر مستحکم کے اندر بست و در باقی نہیں
یا الٰہی مرگ یوسف کی خبر سچی نہ ہو
ایلچی کیسے بلاد مصر سے
سوئے کنعاں آئے ہیں
اک جلوس بے تماشہ گلیوں بازاروں میں ہے
تعزیہ بردوش انبوہ ہوا
روزنوں میں سر برہنہ مائیں جس سے مانگتی ہیں
منتوں کا اجر خوابوں کی زکوٰۃ
سبز سجادوں پہ بیٹھی بیبیو!
اب کسی ابجد سے زندان ستم کھلتے نہیں
اب سمیٹو مشک و عنبر، ڈھانپ دو لوح و قلم
اشک پونچھو اور ردائیں نوک پا تک کھینچ لو
کچی آنکھوں سے جنازے دیکھنا اچھا نہیں

....

بیسویں صدی کے نصف آخر میں شعری افق پر پوری آب و تاب سے نمودار ہونے والی یہ شاعری نہ صرف اپنے متقدمین کی شاعری سے انتہا درجے کی مختلف اور منفرد تھی بلکہ جناب احمد ندیم قاسمی کے مطابق جناب اختر حسین جعفری کی شاعری غالب کے بعد، غالب جیسی شاعری کی واحد مثال ہے کوٹ غالب کی شاعری کی طرح یہ شاعری بھی بظاہر پیچیدہ مگر بباطن اتنی ہی تہہ دار ہے۔ یہ ایک ایسی بھرپور شخصیت کی شاعری ہے جو حد درجہ ہنر مند بھی ہے اور اس کا تخلیقی وفور اس کے لفظ لفظ سے چھلکا پڑ رہا ہے اس کا وجود فن شاعری کی تجسیم ہے۔ کم سے کم 1947 کے بعد اس پائے کا پیکر ساز اور تمثال ساز اور علامت ساز اور تراکیب ساز شاعر بمشکل ہی دستیاب ہوگا۔ یقیناً اقبال کے بعد راشد اور فیض اور مجید امجد اور ظہور نظر کی شاعری کئی جہات سے مثالی ہے مگر اختر حسین جعفری کا اسلوب اظہار سب سے الگ پہچانا جا سکتا ہے، یہ ایک ایسے بلند معیار کا اسلوب ہے جسے کوئی بھی دوسرا بڑا

شاعر اختیار کرنے کی کوشش کرے گا تو ٹھوکر کھائے گا۔ ان کوٹ

فلسفے کے استاد اور صاحب بصیرت نقاد جناب محمد ارشاد کے مطابق ابوالمعانی مرزا عبدالقادر بیدل کے بعد اردو اور فارسی شعری روایت میں اختر حسین جعفری کا نام سب سے اہم اور معتبر حوالہ ہے۔ جبکہ جابر علی سید کے مطابق جناب اختر حسین جعفری اس عہد کا سب سے اہم نظم گو شاعر ہے۔

رسالہ فنون اور دیگر رسائل میں چھپنے والی تنقیدی آرا کے مطابق جناب اختر حسین جعفری، ناظم حکمت محمود درویش، ٹی ایس ایلیٹ اور پابلو نرودا ایک ہی قبیلے کے افراد ہیں۔

معزز قارئین یہ تنقیدی آرا جہاں جناب اختر حسین جعفری کی علمی اور شعری عظمت کا اعتراف کرتی ہیں وہاں قارئین شعر و ادب کے اذہان میں کچھ سوالات بھی قائم کرتی ہیں کہ آخر اس شاعری میں ایسا کونسا تخلیقی جوہر ہے جو اسے نہ صرف متقدمین و متاخرین کی شاعری سے ممتاز کرتا ہے بلکہ اس شعری اسلوب کو مستقبل گیر اسلوب بھی قرار دیتا ہے۔ اور اس شاعری کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں جن کے باعث اسے عظیم، بے مثال اور لازوال شاعری قرار دیا جاتا ہے جناب اختر حسین جعفری صاحب کی شاعری کے حوالے سے موجود یہ تنقیدی آرا کیا محض فخر و مباہات کا مزاج رکھتی ہیں یا واقعی یہ شاعری ان آرا کی حقدار بھی ہے؟ ان تمام سوالات کا جواب جناب اختر حسین جعفری کی کتب 'آئینہ خانہ' اور 'جہاں دریا اترتا ہے' کی شاعری کو خود فراہم کرتا ہے البتہ جواب کے متلاشی علم جو اور متجسس قاری پر جناب اختر حسین جعفری کی شاعری یہ ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ اس علمی و تحقیقی مہم میں وہ بالعموم اردو فارسی شعری روایت کے سفر سے منزل بہ منزل آگاہ ہو اور بالخصوص اردو نظم کے دستیاب اور دریافت شدہ شعری علاقے اس کی نگاہ میں ہوں اور نئے شعری علاقوں نئی شعری ابعاد و جہات کی شناخت کے لئے درکار اہلیت، تنقیدی استعداد اور بصارت بھی رکھتا ہو۔

اگر ہم ان قائم کردہ سوالات کی بہتر تفہیم کے لئے اردو نظم کی روایت کو ذہن نشین رکھیں تو ہم اس امر سے آگاہ ہوتے ہیں اردو نظم کی روایت مغرب کے تتبع میں شعری اظہار کے لئے نئے شعری پیراہن کی تو آرزو رکھتی ہے مگر اپنی فکری اور تخلیقی عادات کے سبب مغرب کے طرز اظہار و احساس سے کسی حد تک نا آشنا رہتی ہے۔ اردو شعری روایت میں ہمیں قادر الکلامی، مضمون نگاری، معنی آفرینی کے خزائن تو دستیاب ہیں مگر اردو شعری روایت سخن کی پرورش کے لئے اشک غم سادہ پر ہی اصرار کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ایسا نہیں کہ متقدمین معاشی، سماجی طبقاتی سیاسی ناہمواریوں کے کرب سے آشنا نہیں تھے یا زندگی کے دیگر مسائل ان کی نگاہوں سے اوجھل تھے مگر اردو شعری روایت کے محبوب ترین مضامین گل و بلبل عشق و محبت ہجر و وصال، تصوف

احساس زیاں رائگانی زمانے کی ناقدری احساس ندامت وغیرہم ہی قرار پائے۔ یہی سبب ہے کہ مغرب کی شعری روایت کی تقلید میں اردو شعری روایت قافیے اور ردیف کی پابندی سے تو کسی حد تک آزاد ہوتی دکھائی دیتی ہے مگر موضوعات اور طرز اظہار کی سطح پر اپنی مخصوص فکری اور تخلیقی عادات کی مقید ہی دکھائی دیتی ہے۔ اور مزید کسی مغربی شعری ڈھانچے کی پیروی یا غیر رسمی شاعری کو بدعت شمار کرتی ہے۔ بھلا ہو نظیر اکبر آبادی، مولانا الطاف حسین حالی اور ترقی پسند تحریک کا جس نے نہ صرف محبوب کے روایتی تصور کو تبدیل کیا بلکہ زندگی کے دیگر سنجیدہ مسائل سے متعلق میں کی بے رخی اور بے اعتنائی کا اظہار بھی کیا اردو شعری اور نثری روایت کو نئے موضوعات، نئے امکانات اور جدید تر طرز اظہار سے آشنا بھی کیا۔ یہ خصوص اور امتیاز صرف ترقی پسند تحریک کو ہی حاصل ہے کہ اس تحریک نے نہ صرف سماجی ترقی میں معاون شعر و ادب کی تخلیق کا علم بلند کیا بلکہ تمام تر تعصبات سے بلند ہو کر بہتر معاشرے کی تشکیل و تعمیر کے لئے رجعت پسند نظریات و عقائد سے انحراف بھی کیا اور زمین پر صلیب کی صورت گڑی میزان کو اپنی تخلیق اور فکر کا عنوان قرار دیا جس کے پلڑے ہر راست فکر کی عمودی قوت کے منکر ہیں اور اسی میزان کے پلڑے میں انسان ایک یرغمالی کی صورت زندہ اپنی رہائی کی قیمت پوچھ رہا ہے۔ جناب اختر حسین جعفری ترقی پسند شاعر تھے۔ یہ اوائل عمری سے شعر و ادب سے ان کے فطری رجحان اور منشی میلہ رام کی محنت کا ہی نتیجہ تھا کہ انہوں نے ساتویں جماعت میں ورڈز ورتھ کی شاعری کا کچھ حصہ فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور انٹرمیڈیٹ کے سال اول میں انہوں نے جناب ایم ڈی تاثیر اور جناب فیض احمد فیض جیسے شعرا کی اعزازی ادارت میں ایک ادبی مجلے کی اشاعت کا بطور مدیر اہتمام کیا۔ اور اسی زمانے میں بطور کنوینیر ترقی پسند مصنفین انہوں نے تانگہ بانوں اور خاکروبوں کی ہڑتال کے ذریعے ان کے حقوق کے لئے آواز بلند کی۔ اسی نوع کی سیاسی سرگرمیوں کی بنیاد پر وہ اکثر مرکزی اور مقامی حکومتوں کے زیر عتاب رہتے۔ سید سجاد ظہیر کو پناہ دینے کے جرم کی پاداش میں ضلعی حکومت نے انہیں نہ صرف پابند سلاسل کیا بلکہ طلبا کی سیاسی سرگرمیوں سے دور رکھنے کے لئے انہیں کالج سے ایکس پیل بھی کر دیا گیا۔ ترقی پسند تحریک اور دیگر سیاسی سرگرمیوں کے باعث گرایجوشن تک وہ مختلف کالجز میں زیر تعلیم رہے۔ قربان طاہر اور بابائے سوشلزم فاضل رشیدی اور منو بھائی اسی زمانے میں ان حلقہ احباب میں داخل ہوئے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب جناب شہزاد احمد جناب احمد فراز اور جناب اختر حسین جعفری انٹر کالجیٹ مشاعروں میں شریک ہوتے اور یہ تینوں شعرا پہلے، دوسرے یا تیسرے انعام کے حقدار قرار پاتے۔

1951 کا سال جناب اختر حسین جعفری کے شعری سفر میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے 1951 کے ادب لطیف

کے شمارے میں جناب اختر حسین جعفری کی نظم کو اس سال کی بہترین نظم کے اعزاز کا حقدار قرار دیا گیا اور شاعرات میں محترمہ زہرا نگاہ صاحبہ کی نظم بہترین قرار پائی۔ سال 1951 میں شہرت کے نقطہ عروج اور فن شاعری میں منفرد اور معتبر شناخت کے حصول کے بعد انہوں نے شعر گوئی ترک کی اور کم و بیش 24 برس کے بعد 1973 میں شہرہ آفاق نظم

تجھ کو کس پھول کا کفن ہم دیں
تو جدا ایسے موسموں میں ہوا
جب درختوں کے ہاتھ خالی ہیں

کے ساتھ شعری افق پر نمودار ہوئے۔ چوبیس برس پر محیط یہ خود ساختہ خاموشی جناب اختر حسین جعفری کے مطابق یہ دور ان کی unlerning کا دور تھا گویا بطور شاعر یہ اختیاری خاموشی اپنی مسماری کے بعد ایک نئے طرز احساس اور طرز اظہار کے ساتھ فن شاعری کی طرف مراجعت کا عمل تھا۔ وہ اس امر سے بخوبی آگاہ تھے کہ نظیر اکبر آبادی اقبال فیض ن م راشد، مجید امجد جیسے شعرا کی روایت کی علمبرداری ایک مشکل عمل ہے اور اس علمبرداری کا خود کو اہل اور حقدار ثابت کرنے کے لئے نہ صرف ایک نئے poetic idiom کو ایجاد کرنے کی ضرورت ہے بلکہ اردو شعری روایت کو اپنی معتبر شناخت کے لئے ایک منفرد حوالے کی بھی ضرورت ہے ایک ایسا حوالہ جو اقوام عالم کی شعری روایت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی استعداد و صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ اس منزل کے حصول کے لئے انہوں نے ترقی پسندی کو اپنی فکر کی بنیادی اکائی تو قرار دیا مگر ترقی پسند نظریات کے زیر اثر وجود میں آنے والی شاعری پر ناقدین کے تحفظات اور فن شاعری سے قاری کے مطالبات اور توقعات کو ذہن نشین رکھتے ہوئے انہوں نے اک نئی طرز سخن کی ایجاد کا رستہ اختیار کیا۔ جناب اختر حسین جعفری اس امر سے آگاہ تھے کہ نظم آزاد نے قوافی کی بندش کی روش سے انحراف تو کیا ہے مگر فکری سطح پر آج بھی وہ رواجی شعری ڈھانچوں کے حصار میں ہے روایتی نظم آزاد کہلانے کے باوجود کہانی افسانے یا عشقیہ داستان کا بیانیہ سا مزاج رکھتی ہے اور موضوعات کی سطح پر بھی اردو شعری روایت کے محبوب ترین مضامین کی روداد ہی سناتی ہے۔ یقیناً ترقی پسند تحریک کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس فکر نے greater love جیسے نظریات سے شعر و ادب کے ذریعے سماجی ترقی میں معاونت کا کردار ادا کیا بلکہ اردو شعری و نثری روایت کا دامن بھی مالا مال کر دیا مگر ترقی پسند فکر کے ناقدین اور غیر جانبدار شائقین شعر و ادب نے اس نظریاتی فکری تحریک کے زیر اثر تخلیق ہونے والے ادب کو نہ صرف بائیں بازو کی فکر کا ضمیمہ قرار دیا بلکہ اس نوع کی شاعری کو استثنیٰ کے ساتھ سیاسی نعرہ قرار دے دیا، فیض صاحب اور ان کی قبیل کے دیگر شعرا اور افسانہ نگاروں نے یقیناً اس نئی فکری روایت کی آبیاری مگر ہر بنیادی فکری ڈھانچہ اپنی بقا کے لئے سپر سٹرکچر کا مطالبہ کرتا

ہے یہی وہ موڑ ہے جہاں سے جناب اختر حسین جعفری نے موجود اور دستیاب شعری روایت کو نہ صرف جدید تر اظہار اور جدید تر طرز احساس سے روشناس کروایا بلکہ ترقی پسند فکر کے زیر اثر تخلیق ہونے والے ادب کی نظریاتی شناخت کا دفاع بھی کیا اس طرز سخن کو فنی، شعری اور جمالیاتی سطح پر ایک معیار اور اعتبار بھی عطا کیا یہی وہ معیار ہے جس کے سبب جناب اختر حسین جعفری کی شاعری کلاسیک کے درجے پر فائز اور متمکن ہوئی اختر حسین جعفری کی شاعری نعرہ نہیں ہے اور نہ ہی اپنا مافی الضمیر بیان کرنے جزئیات نگاری پر انحصار کرتی ہے یہ شاعری ایک ایسے آگاہ شاعر کی تخلیق ہے جو بیک وقت اردو شعری روایت اور مغربی شاعری کے رجحانات واثرات سے آگاہ بھی تھی اور نئے امکانات کی دریافت کی آرزو مند بھی تھی یہ شاعری ماڈرن ازم، سمبلزم امیجزم ازم جیسے mode of expressions کی تاثیر بھی رکھتی ہے اور اردو شعری روایت کا مخصوص گداز بھی رکھتی ہے یقیناً جناب اختر حسین جعفری کے تخلیقی وفور کا نقطہ معراج vortex ہے اور vorticism میں وقت کا تصور ماضی حال اور مستقبل کی شناختوں سے ماورا ہے اور ہم عصریت کے رواجی تصور پر خط تنسیخ کھینچتا بھی دکھائی دیتا ہے جناب اختر حسین جعفری اپنے متقدمین کے تتبع میں بیانیہ انداز میں کرہ ارض پر موجود انسان کو درپیش مسائل نشاندہی کے لئے جزئیات نگاری نہیں کرتے بلکہ مغرب اور مشرق کی روایت کے نچوڑ سے ان دونوں روایات کو ایک نیا طرز احساس تجویز کرتے ہیں دس بیس پچاس یا سو الفاظ سے نظم کی صورت ایک تصویر بناتے ہیں اور اپنے قاری کو نوع انسانی کو درپیش مسائل کا چشم دید گواہ بنا دیتے ہیں اختر حسین جعفری کی شاعری کسی مخصوص زمانے کے انسان کے سماجی سیاسی طبقاتی اور معاشی مسائل کی نشاندہی تک خود کو محدود نہیں رکھتی بلکہ ہمعصریت کے جدید تر تصور کے ذریعے قاری کی تعلیم و تدریس کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے اور اس کی جمالیاتی حسیات کی تشفی کا سامان بھی مہیا کرتی ہے۔ جناب اختر حسین جعفری کی نظم ایک ایسا طرز اظہار و طرز احساس ہے جسکی نظیر اردو فارسی شاعری میں ناپید ہے یوں تو جناب اختر حسین جعفری کی شاعری خود اپنی عظمت انفرادیت اور جدید ترحسیت پر گواہ ہے مگر میری رائے میں ان کی نظم عکس اور فاصلے ان کے کرافٹ، فکر اور طرز اظہار کا در قاری پر وا کرتی ہے اور یہ در اس ڈائمنشن اس شعری علاقے میں کھلتا ہے جو صرف اور صرف جناب اختر حسین جعفری کی فکری شعری اور فنی ملکیت ہے نظم عکس اور فاصلے انتہائی منفرد شعری واردات سے یوں آغاز ہوتی ہے

دیا سلائی جلی تو شعلہ
دیا سلائی جلی تو تند اور تیز شعلہ
کثیف شیشے کی سرحدوں میں ہزار ہا صورتیں دکھا کر
بکھر گیا ہے

کثیف شیشے میں ترے چہرے پہ کرب و ہیجان کا
دھواں ہے
وہی دھواں سا
جو میرے تازہ سلگتے سگریٹ سے اٹھ رہا ہے
زبان شعلہ
کہاں سے چل کے کہاں تک آئی
کہاں تھی موجود اور پہنچی کہاں پہ تصویر نارسائی
دھوئیں کے سائے میں تیز رفتار ریل گاڑی
رواں ہے اندھے سفر پہ گویا
سیاہ انجن کے خشک حلقوم سے نکل کر مہیب چیخیں
تیرے لبوں پر بکھر گئی ہیں
رواں دواں ساعتوں کے پہیے دلوں کے کچے
بدن سے گزرے
تو کتنے نیلے نشان ابھرے ہیں
تیرے رخسار پر جبین پر
شکستہ بازو لٹک رہا ہے
ہر ایک سگنل گرا ہوا ہے
کہاں پہ اتریں کہ تیز آندھی ہے اور بادل گھرا
ہوا ہے

1431 الفاظ پر مشتمل یہ تصویر اپنی معنویت یوں بیان کرتی ہے سگریٹ کے سلگانے کے عمل سے یہ شعری منظر آغاز ہوتا ہے اور دیا سلائی کے جلنے سے روشن ہوتا یہ شعلہ کثیف شیشے سطح پر تصویریں دکھا کر بکھر جاتا ہے اور بکھرتے ہوئے نظم کے بنیادی کردار کے چہرے پر کرب و ہیجان کی کیفیت کو بیان کرتا ہے اور ریل گاڑی جو اندھے سفر پر رواں ہے اس کے حلقوم سے نکلنے والی چیخیں اس کے چہرے پر overlap ہوتی ہیں اور یہ مہیب چیخیں نوع انسانی پر گزرنے والے ساعتوں کا ازلی کرب کا احوال بیان کرتے ہوئے بے جہتی بے سمتی کو اس کرب کا باعث قرار دیتی ہے

ایک ساعت یعنی سگریٹ سلگانے کے عمل سے آغاز ہونے والی یہ نظم ایک منظر دکھا کر اپنے اختتام کو پہنچتی ہے اور تمثیل کے انداز میں نوع انسانی کی حالت زار کو بیان کرتے ہوئے قاری پر ایک کیفیت طاری کرتی ہے اور یہی کیفیت اس منفرد اور مختلف شاعری کے ابلاغ کا کسی سطح پر فریضہ بھی انجام دیتی ہے۔ اس شاعری کے عدم ابلاغ کا شکوہ وہ قارئین کرتے ہیں جو روایتی شعری ذوق رکھتے ہیں اور شاعری سے ان کی رغبت محض pleasure pursuit کے لئے ہے جدید تر شاعری اور بالخصوص جناب اختر حسین جعفری کی شاعری کی تفہیم کے لئے قارئین کو اس امر کو ذہن نشین رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ شاعری فن شاعری کے باب میں ایک نئی جہت کی حیثیت کی حامل ہے اس شاعری کی تفہیم لے لئے قاری کو فن شاعری سے توقعات اور مطالبات بھی تبدیل کرنے ہونگے جناب اختر حسین جعفری کی شاعری کی تفہیم کے حوالے سے جناب محمد ارشاد کہتے ہیں کہ

جدید شاعری، آزاد تلازمے کی شاعری، اختر حسین جعفری سے پہلے بھی شاعری ہی تھی لیکن یہ شاعری اس شاعری میں میکانیاتی کل تھی میکانیاتی کل ہونے کی وجہ سے یہ حرکت کناں بھی تھی رواں دواں بھی، لیکن قالب بے جان

تھی۔ اختر حسین جعفری نے اس قالب بے جان میں اپنا دم اپنے انفاس پھونک کر اسے میکانیاتی کل سے نامیاتی کل organaic whole بنایا ہے۔ اس کی ہر نظم ایک نامیاتی کل ہے یہی وجہ ہے ہم اسے حصوں بخروں میں تقسیم نہیں کر سکتے۔ اس کی انانومی اسے مار ڈالتی ہے اس کی نظموں کی روح، جان نہ نظم کے شروع میں ہے نہ وسط میں ہے اور نہ آخر میں بلکہ کسی بھی جاندار شے کی طرح، نامیاتی کل کی طرح، ہر انگ میں ہر عضو میں ہر مصرعے بلکہ ہر لفظ میں ہے ہم اس کی نظموں کی روح، مرکزی خیال کو کسی ایک جگہ locate کرنا چاہتے ہیں اور نہیں کر پاتے، ہمیں ناکامی اس لئے ہوتی ہے کہ اس کی نظم اس خیال سے جسے مرکزی کہا جاتا ہے، نہ تو اس سے متصف ہے اور نہ اس سے عاری، یہ خیال اس کی نظم کے مرکز میں ہوتا ہے نہ کسی دوسرے ایک انگ میں مرتکز یا مرکوز، بلکہ ساری نظم میں ساری ہوتا ہے

ان کوٹ

اردو نظم کے قاری کو اس امر کو ذہن نشین رکھنا ہو گا کہ جناب اختر حسین جعفری نے نہ صرف ترقی پسند شاعری بلکہ فن شاعری کا نصاب اپنی شاعری کی صورت میں فن شاعری کے باب میں درج کیا ہے اور اس شاعری کی بنیاد انہوں نے انسانی کرب اور درد پہ رکھی ہے ایسا درد جو بظاہر فراقی ہے مگر اپنی تاثیر اور دانائی کی بنیاد پر کائناتی ہے اور اسی درد کو وہ نظم کی بقا کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔

جناب اختر حسین جعفری فرماتے ہیں کہ

نظم پرائے درد پہ زندہ کیسے رہتی
تم سے
آتی جاتی سانس کا ناطہ تھا
سانس کی ویراں راہگزر پر جب لفظوں کی شمعیں
روشن ہو جاتی تھیں
تم آتے تھے
تم آتے تھے اور ادھوری نظم مکمل ہو جاتی تھی

اب پلکوں پر رات ڈھلے تک جاگنے والا باقی کوئی
لفظ نہیں ہے
جھوٹی بارش کے پانی سے بہتی ندی
کب تک بہتی
نظم پرائے درد پہ زندہ کیسے رہتی

جناب اختر حسین جعفری کی شاعری کی کما حقہ تفہیم اور اس شاعری کے کے مقام و مرتبے کو سمجھنے کے لئے ایک نئی فکر رسا اور ایسے رستے کی فکری مسافرت کی ضرورت ہے جو جناب اختر حسین جعفری کے شعری علاقے تک رسائی کو ممکن بنا سکے یہی سبب ہے کہ محفوظ اور شاسا راستوں کے شائقین کو نئی شاعری کی تفہیم کے لئے رستہ نہیں ملتا اور وہ حیرتی نگاہ سے ہمراہیوں سے سوال پوچھتے ہیں کہ مجھے رستہ نہیں ملتا اور یہی سوال جب اختر حسین جعفری تک پہنچتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ

سر شک خون رخ مضموں پہ چلتا ہے تو اک رستہ
نکلتا ہے

☆☆☆☆☆

رنگریز

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے برسوں پہلے کہا تھا:

رنگریز جسم و جاں نے از خمستانِ عدم
خرقہ ہستی نکالا ہے بزنگ احتیاج

.....

اس شعر کو کس نے کس طرح سمجھا اور اس کے کیسے کیسے مطلب نکالے، اس کی تشریحات میں کیا کچھ لکھا گیا اس سے قطع نظر معروف شاعرہ، کالم نگار صوفیہ بیدار اس قدر متاثر ہوئیں کہ انہوں نے اپنے پہلے افسانوی مجموعہ کا عنوان ہی ''رنگریز'' رکھ دیا۔ اس مجموعہ کی اشاعت لاہور کے ایک ممتاز اشاعتی ادارے نے کی اور خوبصورت انداز اپنایا۔ اس کا ٹائٹل بھی اپنے نام کی مناسبت سے جاذب نگاہ ہے۔ یہ رنگین بھی ہے اور اس میں افسانوی اشارے بھی موجود ہیں۔ کتاب کے لیے صوفیہ بیدار نے چودہ افسانوں کا انتخاب کیا ہے انہوں نے مختلف کہانیوں کو انتہائی ذمہ داری، الفاظ کے چناؤ اور اپنے شاعرانہ رنگ سے سینچا ہے۔ کہانیاں محبت کی ہیں لیکن انداز بہت سوں سے جدا ہے۔ لہٰذا طاہرہ اقبال نے دیباچے میں یہ پھڈا ڈال دیا ہے کہ ادبی پنڈت فیصلہ کریں کہ صوفیہ شاعرہ ہے یا کہ ایک منفرد افسانہ نگار۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اس نے اپنی کہانیوں کو افسانوی رنگ دے کر وہ کچھ کہہ دیا جو آج کل علامتی طور پر بھی نہیں کہا جا رہا۔ اب کوئی اس سے خواہ کتنا ہی اختلاف کرے، منکر نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہی صوفیہ بیدار کی ہنرمندی اور چالاکی ہے کیونکہ وہ صوفی نہ بھی سہی بیدار ہے اس کی ہر کہانی میں لفظوں کی بُنت سے ایسے اتار چڑھاؤ

ناصر نقوی

موجود ہیں جن سے کہانی بجھارت محسوس ہوتی ہے۔ پھر بھی پوشیدہ ہرگز نہیں رہتی۔ اس کا لفظ لفظ ناپ تول کے ساتھ جملہ سازی کے خوبصورت بندھن میں بندھا ہے جس سے اس کی شاعرانہ انداز کی جھلک بھی موجود ہے۔

صوفیہ بیدار نے اپنے معاشرے کو بہت قریب سے دیکھا، پرکھا بلکہ جہاں گردی اور کتاب دوستی ہر راز سے واقف ہے۔ عورت ہونے کے ناطے اپنی معاشرتی بیداری میں اس نے بڑے سلیقے سے "حوا کی بیٹی" کے دکھوں کو نہ صرف بیان کیا ہے بلکہ ان کے سدھار کے راستوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ فلسفے اور لبرل ازم کے ساتھ رجعت پسند رجحانات کا تذکرہ بھی کہانیوں میں موجود ہے لیکن جو کچھ ہے وہ حقیقت کے قریب تر کہا جا سکتا ہے کیونکہ کوئی افسانہ اور کہانی سیدھی سیدھی لفظوں اور محاوروں کی بنیاد پر زبردست نہیں بنائی گئی۔ محبت، عشق زمینی بھی ہے زمانی بھی، ہراسگی، محنت مزدوری اور محدود و لامحدود وسائل کے مسائل بھی تواتر سے زیر بحث لائے گئے پھر بھی ایسی بھرمار نہیں کہ کہیں یکسانیت اور واعظ پایا جائے۔ چند مواقعوں پر مشکل پسندی اور مختلف الفاظ کا استعمال قاری کے ذہن پر بوجھ بھی بنتا ہے لیکن صوفیہ اسے چند لمحوں میں ہی آسان بنا دیتی ہے کیونکہ اس کا قلم عام لوگوں کی نبض سے خاصا واقف ہے۔ اسی لیے ان کی تحریروں میں طنز و تنقید کی چھریاں بھی ہیں اور معاشرتی نشیب و فراز کے رنگ بھی۔ ذرا ملاحظہ کریں۔ غیرت کے نام---- کی چند سطریں:

"ہاں اور تمہاری آئیڈیل وہ عورتیں ہیں جو شہروں اور دیہاتوں کی دور دراز زمینوں سے رسومات میں گزر بسر کرنے والوں میں سے اپنی پسند کی کہانی اٹھا لیتی ہیں پھر جنسی تشدد کے واقعات کو سڑکوں اور چوراہوں، پبلک پلیس اور کلبوں سے لے کر اخباروں کے دفتروں تک اچھالتی ہیں۔ بتاؤ — بتاؤ — آج تک ان ہتھکنڈوں سے کتنی کمی آئی ہے اس نوع کے جرائم میں بلکہ بچہ بچہ گینگ ریپ کے نام سے آشنا ہے۔

"جنسی تشدد دونوں طرح کی عورتوں کے ساتھ ہوتا ہے، لٹ جانے کے بعد کچھ سڑکوں، چوراہوں پر زہر کے گھونٹ کو گلے سے اتار لیتی ہیں۔ تمام خاندان کے پینے کے پانیوں میں عصمت دری کا زہر نہیں گھولتیں — مگر انصاف؟؟؟

کونسا انصاف سونیا؟ اب تک کوئی واقعہ بتاؤ جس میں عورت کو انصاف مل گیا ہو اور اس کے بعد زندگی نارمل گزری ہو یا پھر ان کے والدین کی ان کی بیاہی بہنوں، بن بیاہی بہنوں کی زندگی سہی رہ سکی ہو؟

یہ سچ ہے مگر کیا زندگی اپنے برعکس ہو سکتی ہے--- کیا زندگی کو اس نظر سے دیکھا جا سکتا

ہے کیا اس ذلت کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔۔۔ سو نیا سوال پر سوال کیے جا رہی تھی؟ اگر آپ اور میں ان سطور کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیں تو اس ایک پہرے میں حوا کی بیٹی سے ناانصافی، بے جا تشدد اور مجبوری کی داستان کھل کر سامنے آ جائے گی۔ لیکن صوفیہ بیدار کی کاری گری یہ ہے کہ آپ اس کی سادہ مگر ''بل کھاتی'' تحریروں میں لفظوں اور واقعات کے اتار چڑھاؤ کو محسوس کرتے ہوئے کہانی کی بھارت کو بوجھنے کے لیے اس کے اختتام سے پہلے نظریں نہیں ہٹا سکتے۔ یہی ہنرمندی قابل ستائش ہے۔ افسانہ نگاروں کی دنیا میں کسی مستند شاعر کی آمد نئی بات ہرگز نہیں، نئی بات تو صوفیہ بیدار نے ازخود پیدا کرنی ہے کہ وہ اسی طرح افسانہ نگاری کی دنیا میں رہنے کے لیے کتنا وقت صرف کرتی ہے اگر اسے اپنے دل و دماغ پر مکمل گرفت رہی تو یہ بات آگے ضرور بڑھے گی اور اس کا قلم اس قدر توانا ہے کہ اسے منفرد مقام مل جائے لیکن ذرا سی کوتاہی بھی ہوئی تو شاعرہ صوفیہ اس کا گلا دبا دے گی کیونکہ وہ افسانہ نگار سے نہ صرف سینئر ہے بلکہ اس حوالے سے اس کی اپنی شناخت ہے۔ یہ کم بخت حسد ہر جگہ موجود ہوتا ہے اس سے بچنا بھی ہر شخصیت کے بس کی بات نہیں، ویسے بھی بڑے درخت کے سائے تلے چھوٹے درخت کا پروان چڑھنا مشکل ہی ہوتا ہے۔ اب یہ ذمہ داری صوفیہ بیدار کی ہے کہ وہ احتیاط سے دونوں کے پھولنے پھلنے کے لیے آبیاری کرے۔ ہر دو صورت میں داد و تحسین اسی کا مقدر بنے گی لیکن ہماری روایت ہے کہ کچھ والدین اپنے بڑے پر زیادہ مہربان ہوتے ہیں اور کچھ کو سارا پیار چھوٹے پر آتا ہے یہاں یکساں محبت کا تقاضا ہے، انصاف کا ترازو صوفیہ کے ہاتھ میں ہے اگر اس نے ڈنڈی نہ ماری تے ''ستے خیراں''، ورنہ یہ لڑائی اس کے اپنے وجود میں در آئے گی کہ صوفیہ بیدار بڑی شاعرہ ہے کہ اچھی افسانہ نگار، دنیائے ادب میں یہ تکرار تو اب رکنے کی نہیں، اسے تنقید اور تعریف کا سامنا رہے گا کیونکہ جہاں مثبت تنقید نہ ہو وہاں تعریف کے راستے بھی بند ہی رہتے ہیں۔ ہماری دعا اور خواہش ہے کہ صوفیہ بیدار اسی ہمت و عزم سے کامیابیاں سمیٹتی رہے اور اس کا قلم چلتا رہے اور جس طرح ادب نواز معروف شاعر و ادیب منصور آفاق کے وسیلے سے ''رنگریز'' کو منزل مل گئی، اللہ رب العزت محمد فہد کو بھی ہمت حوصلہ دے کہ وہ اسی طرح ''لفظ'' کی حرمت اور کتاب دوستی کا فریضہ انجام دیتے رہیں۔ ''رنگریز'' کی خوبصورت اشاعت ان کی ادبی نزاکتوں کے علم کو ظاہر کرتی ہے، یقیناً شعبہ طباعت کے حوالے سے ''رنگریز'' ایک منفرد اور جاذب نظر عکس ہے۔

☆☆☆☆☆

نروان گھڑی کا سپنا، ایک جائزہ

شاہد اشرف

تخلیق کار کو عجیب مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ تخلیقی عمل کے دوران میں قطع و برید اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں مگر ساتھ ہی خیال پر توجہ مرکوز رکھنا پڑتی ہے۔ یہاں تخلیق کار کا امتحان شروع ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خیال پوچھ کر دستک نہیں دیتا ہے۔ اس خیال کا تعلق عالم گیر سچائی سے پیدا ہو جائے تو کیا کہنا۔ بسا اوقات یہ خیال تخلیق کار کی نفسیات، مزاج اور نظریے سے ہم آہنگ نہیں ہوتا ہے۔ خیال کی یک رخی پسندیدہ نہیں گردانی جاتی ہے۔ ملٹی ڈائمینشنل خیال پذیرائی حاصل کرتا ہے۔ شاعر لکھتے ہوئے کئی خیالات محض اپنی ذات سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش میں ضائع کر دیتا ہے۔ اس کی تہذیب، ثقافت اور اخلاقیات تخلیق پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اس کے نزدیک زندگی کا واضح تصور موجود ہوتا ہے اور وہ اس دائرہ کار میں رہ کر قاری سے مخاطب ہونا پسند کرتا ہے۔ عمدہ خیال کی ندرت اور بیان میں تازگی کو قربان کرنا آسان نہیں ہوتا ہے مگر تخلیق کار اسے گوارہ کرتا ہے۔ یہاں مسئلہ داد و تحسین کا نہیں ہے۔ اسے اپنے تصورات عزیز ہوتے ہیں۔ عام مشاہدہ ہے کہ کتاب کی اشاعت کے موقع پر کئی تخلیقات

معیار سے قطع نظر مطابقت نہ ہونے کی وجہ سے خارج کر دی جاتی ہیں۔ ہر شاعر کی مطابقت کا دائرہ کار اسے خاص پیرایۂ اظہار بھی عطا کرتا ہے۔ یعنی شاعر لکھتے ہوئے خود طے کر لیتا ہے کہ اسے لکھنے کے لیے کیا انداز اختیار کرنا چاہیے۔ بیان کرنے کے سو ڈھنگ ہوتے ہیں۔ ایک ہی بات کو کئی مختلف انداز میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ جو انداز ایک ادیب کے لیے پسندیدہ ہوتا ہے، دوسرے ادیب کے نزدیک غیر موزوں ہو سکتا ہے۔ یہاں ادیب کی ذہنی پرداخت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ادیب کی خاص ماحول میں تربیت کے نتیجے میں پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے معیارات تشکیل پاتے ہیں۔ اسے بہر حال اپنا نقطۂ نظر عزیز ہوتا ہے۔ غزل میں قطع و برید کا عمل نظم کی نسبت زیادہ آسان ہوتا ہے۔ یہاں صرف ایک شعر پیش نظر ہوتا ہے۔ نظم میں مکمل موضوع سامنے رکھ کر قطع و برید کا عمل انجام پاتا ہے۔ اس عمل میں جزوی یا کلی نظم کی قربانی بعید از قیاس نہیں ہے۔

مجھے یہ تمہید ثاقب ندیم کی نظموں کو سامنے رکھ کر باندھنا پڑی ہے۔ نظم ''ملاقات'' میں تخلیق کے دوران میں قطع و برید کے عمل کا عمل دیکھیے تا کہ اس پر مزید بات کی جائے۔

نظم مجھ سے ملی
خواب کے کھیت میں
آب و گل کے بکھیڑے سے باہر نکلتے
ہوئے بیچ میں
تیرے پاؤں سے لپٹی ہوئی
نقرئی ریت میں
ایک بہکی ہوئی رات کے
آخری پہر میں
نظم مجھ سے ملی

.....

نظم کے اس ابتدائی حصے میں شاعر نے قطع و برید کے بہت سے مراحل طے کیے ہیں۔ گمان کیا جا سکتا ہے کہ اس نے نظم کا موناج بنانے کے لیے بہت سے مناظر کا انتخاب کیا ہوگا اور پھر آہستہ آہستہ نظم کی مجموعی فضا سے مطابقت کے پیش نظر کئی بار قطع و برید کا عمل دہرایا گیا۔ کئی مناظر کو منہا کر دیا گیا اور اسی دوران میں نئے مناظر کی تشکیل کا عمل بھی جاری رہا۔ آخر کار نظم نے موناج کی صورت اختیار کر لی۔

یہ عمل کہانی سے حد درجہ مشابہت رکھتا ہے۔ جہاں کردار مختلف مراحل طے کرنے کے بعد ایک خاص صورت میں مجتمع ہوتے ہیں۔ اور کہانی کی کڑیاں آپس میں مل جاتی ہیں۔ ویسے کہانی اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں آتی ہے اور نظم کہانی سے اگلا قدم قرار دی جا سکتی ہے۔ اس صورت حال کو ثاقب ندیم نے اپنی ایک نظم ''دو منٹ کی خاموشی'' میں یوں ادا کیا ہے۔

کہانی
رات بھر خود کو جگاتی
کہانی کو جہاں سے نظم کرنے کی جہد میں
کاتتا ہوں، لفظ کی پونی بناتا ہوں
وہیں پہ حوصلے کو پست کرتا
گھومتا چرخہ کوئی جادو نہیں کرتا

.....

نظم کہانی کی طرح ہوتی ہے اور اس کے تار و پود میں کردار، مکالمے، کلائمکس سمیت دیگر اجزائے ترکیبی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ اس دوران میں شاعر ماہر کہانی کار کی طرح بتدریج قاری کو اپنے ساتھ ساتھ رکھتا ہے اور کسی خاص مقام پر صدمے، حیرت، رنج، افسردگی سمیت کسی ایک کیفیت سے دوچار کر کے فیصلے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔
تخلیقی عمل کے دوران میں موضوع پر گرفت تو یقیناً اہم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر کی پیش کش پر دھیان دینا پڑتا ہے۔ میرے نزدیک شاعری میں ایمائیت کو علم بیان پر فوقیت حاصل ہے۔ میں نے ثاقب ندیم نظموں میں ایمائیت کے نادر نمونے دیکھے ہیں۔ نظم ''ایک سوال کاندھے پر'' کا ابتدائی حصہ ملاحظہ کیجیے:

کہانی سے بھاگا ہوا ہوں
کسی دوپہر کی کڑی دھوپ میں
میں کہانی کی وحشت سے انکار کرتے ہوئے
بزدلوں کی طرح بھاگ اٹھا

.....

زمانے ہوئے تھے
نہ ہونے کی دہشت نے جکڑا ہوا تھا
خدائے ابد نے ازل کے کنارے سے
کن کہہ دیا ـــــ ہو گیا
ایک پردہ گرا ـــــ دوسرا اٹھ گیا

.....

مجھے ثاقب ندیم کی نظموں میں کہانی پن تلاش کرنے میں دقت نہیں ہوئی ہے۔ یہ شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ اگر بعض نظموں کے عنوانات ہٹا دیے جائیں تو کہانی مسلسل جاری محسوس ہوتی ہے۔
اس کی وجہ موضوعات میں یکسانیت قرار دی جا سکتی ہے۔ جو زندگی کی ناآسودگی کے غماز ہیں۔ حیات، کائنات، موت، وقت کے ازلی ابدی سوالات نے حساس دل شاعر کو بے چین کر رکھا ہے۔ نظم ''کن کا انتظار'' ان مسائل و معاملات کی عمدہ عکاسی کرتی ہے:

آنکھ کھولی تو چگنے کو دانہ
قفس میں تھا بکھرا ہوا
بس یہی میری دنیا تھی
کنج قفس میں سکوں کی کوئی لہر تھی
پھر کہانی نیا موڑ مڑنے لگی
میری منقار سے ایک دانہ گرا

.....

اس کے بعد نظم میں درج بالا حالات سے متضاد صورت حال کے بارے میں درد مندی سے اظہار کیا گیا ہے۔ جس کے نتیجے شاعر زندگی کی ناہمواری کا شکوہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ نظم ''نروان گھڑی کا سپنا'' میں یہ اظہار نقطۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ جہاں وہ گم شدہ ارتکاز تمنا کو ڈھونڈ رہا ہے اور کسی سبز لمحے کی دستک پر گیت گانا چاہتا ہے۔

بہت سی نظموں میں عصری مسائل و معاملات موجود ہیں۔ جن کا تعلق سیاسی تغیرات سے ہے۔ جو الگ مضمون کے متقاضی ہیں۔

نظموں کی ایک خاص تعداد کا موضوع محبت بھی ہے۔ ان نظموں میں بھی دیگر نظموں کی طرح ناہمواری کا واضح اظہار ہے۔ میں ان کی نظموں کو ناآسودگی کا مرقع سمجھتا ہوں۔ یہ ناآسودگی ہرگز مادی نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ذہن و روح اور سماجی و سیاسی معاملات سے ہے۔ بے اطمینانی کا ایسا عمدہ اظہار کم کم دیکھنے میں آتا ہے۔ ان کی ایک نمائندہ نظم ''لیکن میری اپنی راکھ'' کا آغاز ملاحظہ کیجیے:

میں نے دیکھا کیسے تیری اک مسکان سے
خوشبو اپنا پنجرہ توڑ کے پھیل گئی ہے
تو نے سوچا، چپ چپ رہنا
حیرانی کی چادر اوڑھے
ہر شے خاموشی کے معنی ڈھونڈ رہی ہے

اس نظم کا اختتام ان لائنوں پر ہوتا ہے:

قصہ شاید گیت اور خوشبو سے کچھ آگے
ہونٹ جلاتے سگریٹ کا اک لمبا کش تھا
قصہ شاید آخری کش کا خمیازہ تھا
میں نے سوچا
تو کیا جانے
جھڑتی راکھ میں ڈھلتی عمر کی
کتنی راتیں خوابیدہ ہیں
بس اک بات میں کومل، تیور
کتنی باتیں پوشیدہ ہیں

.....

آخر میں مجھے دو نظموں پر الگ داد دینی ہے۔ ایک نظم ڈاکٹر جاوید انور اور دوسری نظم طاہر اصغر پر لکھی گئی ہے۔ دونوں نظموں کی فضا میں مطابقت پائی جاتی ہے اور اس میں زندگی کی تلخیاں موجود ہیں۔ جس کی وجہ سے یک طرفہ رستے کا مسافر آخر کار چپ کی چادر اوڑھ کر خاموشی کو گلے لگا لیتا ہے۔

ماضی کی دیوار سے گرتے کتنے پل تھے
جن کی سمت کا پتا نہیں تھا
وقت کے رتھ کو اپنی مرضی سے مت موڑو
نفرت کا سیال بھرا ہے جس پیالی میں اس کو توڑو
خوشیاں بانٹو، خواب دکھاؤ
اپنے آپ کو، دنیا کو بھی
یا پھر چپ کی چادر اوڑھو
خاموشی کو گلے لگاؤ اور سو جاؤ

☆☆☆☆☆

نعت حسن عقیدت سے جامعاتی علم تک

نعت نے بطور فن اپنا ارتقائی سفر گزشتہ چند دہائیوں میں بڑی تیزی سے طے کیا ہے۔ یہ حسن اظہار عقیدت و محبت کے ساتھ ساتھ جامعاتی سطح کے تحقیقاتی مقالات کا موضوع بنی اور اب اس میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان چند دہائیوں میں نعتیہ صحافت کی ایک ٹرم بھی استعمال ہونے لگی جس میں بہت سے نمایاں نام سامنے آئے جنھوں نے اپنی قلمی صلاحیتوں کو نعتیہ موضوعات کے لیے وقف کیا اور اس فن کی متنوع جہات پر علمی اور تحقیقی انداز سے روشنی ڈالی۔ آج نعتیہ ادب کے منظر نامے پر بہت سے ایسے نام ہیں جنہیں نعتیہ صحافت اور تحقیق و تنقید کے حوالے سے نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس بات میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ نعتیہ موضوعات پر مقالات اور اس پہ دیگر تحقیقی و تنقیدی کام دراصل لکھنے والوں کے ذاتی ذہنی و فکری رجحان کے سبب ہی ہوا ہے اور ملکی ادبی منظر نامے پر اس موضوع اور اس سے وابستہ افراد کے وقیع کام کو کبھی بھی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ اس کے لیے نہ تو سنجیدہ کوشش نعتیہ حلقوں کی طرف سے دیکھنے میں آئی کہ انھیں بھی قومی ادبی دھارے میں نہ صرف خود شامل ہونا چاہیے بلکہ نعت کو بھی دوسری اصناف سخن کی طرح ان قومی فورمز پر موضوع گفتگو بننا چاہیے۔ چونکہ اس فن کیساتھ تقدس، احترام اور اخروی اجر کا تعلق وابستہ ہے اس لیے اس فن سے وابستہ شخصیات کا یہ مسئلہ ہی نہیں رہا جیسا کہ دوسری اصناف کے وابستگان کا ہوتا ہے۔ حالیہ دنوں میں ہونیوالی کثیر سرمائے کی ادبی کانفرنسز میں بھی زندگی کا ہر شعبہ شامل تھا سوائے حمد و نعت کے جس کی وجوہات سے ہر ذی شعور آگاہ ہے۔ اس صورتحال میں ہمیں ایک طرف تو اس کوشش کو بھی تیز تر کرنا ہے کہ قومی وسائل سے ہونے والی ان بڑی تقریبات میں نعت اور نعت سے جڑی ہوئی شخصیات کو بھی وہی مقام دیا جائے جو ان کا استحقاق ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ نعت اپنے موضوع کے وقار اور آفاقی وسعت کے اعتبار سے یہ حق رکھتی ہے کہ اس کے لیے علمی اور ادبی نوعیت کی کانفرنسز کا الگ سے انعقاد کیا جائے جس میں اس کے تمام تر پہلو زیر بحث آئیں جو دیگر ادبی تقریبات میں ممکن نہیں۔ الحمدللہ نعت فورم کے پلیٹ فارم سے ان دونوں جہات پر ایک طرف تو ادبی و صحافتی حلقوں میں موثر آواز اٹھائی گئی اور دوسری طرف اس کی انفرادی اہمیت کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے

سرور حسین نقشبندی

اپریل 2019 میں ''پہلی قومی ادبی نعت کانفرنس'' کا انعقاد وزارت مذہبی امور پنجاب کے باہمی اشتراک سے کر کے ایک کامیاب تجربہ کیا گیا۔ جسے قومی اور ادبی سطح پر اس موضوع کے حوالے سے کی جانے والی ابتدائی کاوش کا اعزاز حاصل ہوا۔ ہر چند کہ یہ اس موضوع کے ساتھ شب و روز بسر کرنے والے ایک دیوانے کا خواب تھا جسے اللہ رب العزت نے کامیابی سے ہمکنار کیا اور اب اس کی توفیق اور عنایت سے یہ سلسلہ تھمے گا نہیں کہ مستقبل قریب میں ان شاءاللہ اس کا دائرہ ملک کے دیگر شہروں اور بیرون ممالک تک لیجانے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔ منہاج یونیورسٹی لاہور نے ملک بھر کی جامعات میں یہ اولین اعزاز حاصل کیا ہے کہ انھوں نے نعت کے موضوع کو باقاعدہ علم کا درجہ دیتے ہوئے اپنے دیگر شعبہ جات کی طرح حسانؓ بن ثابت سینٹر فار ریسرچ ان نعت لٹریچر'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے جس کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے۔ یعنی اب نعت ذوق وشوق، حسن عقیدت، اظہار محبت اور انفرادی فکری کاوشوں سے آگے نکل کر ایک باقاعدہ علم کے درجے میں داخل ہو رہی ہے جہاں نعت کو بطور علم پڑھانے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ نعت کے جامعاتی تشخص کی اسی نہج پر معرفت دراصل ہماری موجودہ اور آئندہ نسلوں کی ضرورت بھی ہے اور وقت کا تقاضا بھی۔ کوئی بھی فن جب علم کی سطح پر جانچا اور پرکھا جاتا ہے تو اس کی طرف فطری رجحان رکھنے والوں کے ساتھ ساتھ دیگر اہل علم کی توجہ بھی اس طرف مبذول ہوتی ہے۔ منہاج یونیورسٹی نے نعت کے موضوع کو علم کا درجہ دیتے ہوئے اپنے حصے کا کام کر دکھایا اور ملک بھر کی جامعات کے ذمے ہے کہ وہ بھی اسی طرز پر اپنے اپنے اداروں میں نعت کے کام کا آغاز کریں۔ قومی ادبی نعت کانفرنس 2023 میں درج ذیل شخصیات اور احباب کے لیے نعت کے مختلف شعبہ جات میں درج ذیل ایوارڈز کا اعلان کیا گیا ہے انھیں بہت مبارک باد۔ لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، ڈاکٹر ریاض مجید (فیصل آباد)، نعتیہ تحقیق وتنقید ایوارڈ، ڈاکٹر عزیز احسن (کراچی)، دیار غیر میں فروغ نعت، سمعیہ ناز (لیڈز برطانیہ)، فروغ نعت ایوارڈ، قمر وارثی (کراچی)، طاہر سلطانی (کراچی)، عبدالغنی تائب (حافظ آباد)، محمد اشفاق غوری (ملتان)، ریاض ندیم نیازی (سبی بلوچستان)، ریاض احمد قادری (فیصل آباد)، سید شاکر القادری (اٹک)، حافظ سبحان سلیم (میاں چنوں)، علامہ عارف جاوید (گوجرانوالہ)، عمران منظور (بیاض لاہور)، ابرار حنیف مغل (کاروان نعت لاہور)، حافظ قاسم مدنی (لاہور)۔

آخر میں یہی گزارش ہے کہ نعت کو جانیے، نعت کو سمجھیے، نعت پر سوچیے، نعت پر لکھیے، اس پر کسی بھی جہت سے کام کیجیے اور نعت پر علمی انداز سے کام کرنے والوں کے معاون بنیے اس یقین کے ساتھ کہ یہ دنیا میں خیر و برکت کا باعث ہونے کے ساتھ ساتھ اخروی اجر کا یقینی سبب بھی ہے اور نعت سے وابستہ ہماری موجودہ اور آئندہ نسلوں کی ضرورت بھی۔

☆☆☆☆☆

میرے ہونٹ سعادت لکھنے لگتے ہیں.....

کچھ کتابیں کتنی اچھی ہوتی ہیں کہ ان کے ساتھ آسمانوں سے ابھی کے ابھی پڑھنے اور فی الفور تحریری رائے دینے کا جبر نامہ نہیں اُترتا۔

جب آپ کو یہ تسلی ہو کہ کسی تقریبِ ناگہانی کے انعقاد پر آپ کو زنجیر سے باندھ کر تنقیدی مضمون پڑھنے کے لیے پیش نہیں کیا جا رہا تو کتاب پر کچھ لکھنا کتنا دل پسند کام بن جاتا ہے۔ کچھ لکھنا، محض اس لیے کہ آپ ایک تحفہ پا کر ایک چھوٹا سا ہدیہ اپنی جانب سے بڑھانا چاہ رہے ہیں۔

ایسی دوست کتابوں پر کچھ لکھ لینا تو ایسا ہے جیسے آسمان سے انعام کی طرح اترتے برف کے گالوں کی طرف لپکنا، جیسے سنبل کے پیڑ سے اُڑتی نرم و ملائم سنبل کے پیچھے بھاگنا اور ڈھیر سی اکٹھی ہو جانے پر ایک چھوٹا سا ریشمی تکیہ بنانا، جیسے..... جیسے کہیں قریب کی اڑان بھرتے ایک مانوس کبوتر کے گرائے ہوئے ایک سفید پر کو ہم بے وجہ ہی اٹھا کر دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ اس لمحے صرف ہمارے لیے، ہمارے ادھورے پن کو مکمل کرنے کے لیے گرایا گیا ہوتا ہے۔

ایسی دوست کتابیں خود ہی آپ کو ڈھونڈتی بن بتائے، دیر سویر گھر آجاتی ہیں۔ تھکا ہارا، مہنگائی کا مارا، لڑائی پہ آمادہ رائیڈر دروازے پہ انھیں لے کر کھڑا ہوتا ہے اور بالکل لحاظ نہیں کرتا کہ آپ ایک مقدس شے یعنی ایک کتاب وصول کر رہے ہیں اور ہو جاتا ہے شروع کہ اللہ کے بندو! مَیں تمھاری وجہ سے مارا مارا پھر رہا ہوں، آخر ضرورت کیا ہے؟ اس پیغام و ترسیل کی اور نہیں جانتا کہ اس لمحے آپ خود کو زمین میں دھنستا ہوا محسوس کر رہے تھے اور ضرورت تھی، بہت ضرورت تھی۔

یوں یہ کتاب ''مجال'' جو ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کی واحد شعری تصنیف ہے، اس کی ایک کاپی گزشتہ ماہ میرے پاس پہنچی تھی۔ اسے اس گھر سے اجنبیت اور مجھے اس کے مستقل قیام سے وحشت اس لیے بھی نہیں ہوئی کہ یہ اشاعت سے پہلے بھی یہاں آچکی ہے۔ لیکن اس وقت ہم آپس میں کچھ بات کہاں کر پائے تھے! اس کا رنگ فق تھا اور منھ سے کچھ بولتی نہ تھی جب حسبِ ہدایت بڑی عجلت میں، مَیں نے اس کا منھ ہاتھ دُھلا، چوٹیاں گوندھ، مینڈھیاں باندھ اس کے ماتھے پر ننھا سا بندی ٹکا سجا دیا تھا اور ہاتھوں پہ مہندی ابھی گیلی گیلی ہی تھی جب اسے رخصت کر دیا تھا اور یہ مڑ مڑ کر مجھے دیکھتی جاتی تھی۔ شاید

عبیرہ احمد

یہ گئے وقتوں والا سنگھار اِسے پسند نہیں آیا تھا۔ میں بسورتی ہوئی نظمیں لکھنے والی، مجھے بس ایسی ہی مشاطگی آتی تھی۔ خیر نہیں صاحب کتاب نے اسے میرے پاس سنورنے کو کیوں بھیج دیا تھا، پر اب کے آئی ہے تو بڑی ہری بھری، بڑی سندر دکھتی ہے۔

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کئی ایک نسبتوں سے میرے دُور پار کے استاد لگتے ہیں۔ میں پہلے باضابطہ تعارف سے پہلے ہی انھیں اتنی بہت سی معتبر نگاہوں کی مدد سے دیکھ چکی تھی کہ تعارف کی نوبت آئی تو مجھے فی الفور اپنی نظروں پہ اعتبار لے آنے میں کچھ بھی دیر نہ لگی۔ ان سچ کی نسبتوں میں سب سے کم خطرناک نسبت اُردو زبان و ادب کی ہے:

یہ تبسم، یہ تکلم، یہ نفاست، یہ ادا
جی میں آتا ہے ترا نام میں اُردو رکھ دوں!

.....

مزے کی بات یہ ہوئی کہ سر سے ملاقات ہوئی تو سب نسبتیں دور کھڑی دیکھتی رہیں۔ مجھے ادب کے ایک استاد کے روبرو کوئی گھڑا گھڑایا فقرہ لڑھکانے سے پہلے کسی سے تائیدی نگاہ چاہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، کسی آنکھ نے مجھے اب اُٹھ جانے کا اشارہ نہیں کیا، فضا میں "سب خیر" کا ورد چلتا رہا اور میں ایک زیرِ تکمیل کتاب کا مسودہ لیے گھر آ پہنچی۔

سر سے پہلی ملاقات میں مجھے اندازہ ہوا کہ وہ خوش طبع ہیں، مہمان نواز ہیں اور چھوٹی چھوٹی نعمتوں کو بہت شکر گزاری سے قبول کرتے ہیں۔ جب ان کی نثری کتابوں کی حرف چینی شروع کی تو استاد کی علمی لیاقت کا بھی معترف ہونا پڑا اور سیدھا سادہ پروف خوانی کا کام اچھی خاصی تحقیق میں بدل کر رہ گیا کیونکہ کتابیں علمی حوالوں سے پُر تھیں اور بیشتر عدیم الفرصت اساتذہ کی طرح سر نے بھی کئی اِندراجات حافظے پر بھروسا کرتے ہوئے کیے تھے۔

یہ سر کا بڑا پن ہے کہ گاہے ماہے، اوکھے سوکھے ہو کر وقت فراہم کر لیتے ہیں جب کہ شہر میں وقت کا کال پڑا ہے۔ شہر میں آج بھیک میں بھی وقت نہیں ملتا ہے اور سر ہیں کہ داستان سننے پہ مُصر اور سنانے پر آمادہ رہتے ہیں:

جب بھی ملنے آؤ گے دو اُمور لازم ہیں
داستان سُننی ہے، داستاں سنانی ہے

.....

ڈاکٹر صاحب بڑے استاد ہیں۔ اپنی بات ہمیشہ پوری کر لیتے ہیں میری گلہ گزاری شروع ہوتی ہے تو اپنے اس شعر کی تفسیر بن بیٹھتے ہیں۔

زخموں سے ہیں چور فضائیں
ان پر مرہم رکھنا سیکھ

.....

اس کے باوجود کچھ باتیں جو افسردہ کرتی تھیں، ان کا ذکر چھیڑا اور خوب چھیڑا:

جو بات آزردہ کرتی ہو
اُس بات کی بات نہیں کرتے

.....

ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب مجال میں کئی اچھے مقامات ہیں جہاں جی بھر کر ٹھہرا جا سکتا ہے اور ایسے بھی جہاں جی کو چار و نا چار ٹھہرنا پڑتا ہے۔ میرے ہونٹ سعادت لکھنے لگتے ہیں جب بیٹی کا ماتھا چومنے لگتا ہوں

.....

اَوجِ مخلوق تھی ، ننگِ اَسلاف ہے
اِبنِ آدم کی دنیا میں موجودگی

.....

یوں تو کہنے کو اُسے دل سے بھلایا ہوا ہے
یہ تردد تو مری جان کو آیا ہوا ہے

.....

جس مشکل سے جان بچاتے آئے تھے
اُس مشکل میں ڈال کے رکھا آنکھوں نے

.....

شاعری کی اس خوب صورت کتاب میں شامل کچھ نظموں اور غزلوں کو ذونیرا بخاری نے انگریزی کے قالب میں ڈھالا ہے، یہ تراجم کتاب ہی میں شامل ہیں، جس سے متون کا موازنہ کرنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ یہ رواں تراجم بلاشبہ متن سے بہت قریب ہیں۔

مجھ کو سیدھی راہ دکھا دے
گرچہ تُو قادر ہے اتنا
مَیں چاہے جس راہ پہ چل دوں
اُس کو اپنی راہ بنا دے!!
(نظم: ''میرے مولا!'')

Show me the straight path
As you are so commanding
whichecer say I want to go
Make it your way
(ترجمہ: ذونیرا بخاری)

کہیں ریشم، کہیں اطلس، کہیں خوشبو رکھ دوں
یہ تمنا ہے تری یاد کو ہر سُو رکھ دوں
یہ تبسم ، یہ تکلم ، یہ نفاست ، یہ ادا
جی میں آتا ہے ترا نام میں اُردو رکھ دوں!
(قومی زبان)

I aspire to escalate silk,
satin, fragrance,
I fance swowing overall
your remembrance
Your smile, your
eloquence, your
elegance, your poise
My heart yourns that
Urdu be your
designance
(ترجمہ: ذونیرا بخاری)

جی کرتا ہے آنکھیں پیچھے لگ جائیں
ماضی مجھ کو اتنا اچھا لگتا ہے

.....

بس اس شعر پر بات تمام کرتی ہوں کہ میرا بھری محفل میں وہ راز کی بات کہہ دینے اور اُس روشن دن کو دُھندلا دینے کو جی نہیں مانتا جس دن ڈاکٹر اشفاق احمد ورک پہ میری کم اعتبار نظروں نے پورا بھروسہ کر لیا تھا۔

☆☆☆☆☆

اظہارِ ذات کا شاعر.....شبیر نازش

اظہار کی راہ میں میرے نزدیک خاموشی آوازوں کا، شور سناٹوں کا اور اندھیرا اجالوں کا مجموعہ ہے، بالکل اسی طرح شاعری عدم احساس اور احساس کا مرقع ہے۔ شاعری ناآسودگی کے بطن سے جنم لیتی ہے۔ شعر کے جنم لینے کا عمل بھی عام انواعِ زندگانی کی طرح کا ہے، مدارج مختلف ہوسکتے ہیں، معائیر مختلف ہوسکتے ہیں مگر اظہار کی سطح پر شعر کا جنم ناآسودگی کے کھردرے ہاتھوں ہی ہوتا ہے۔ شعر طربیہ (نشاطیہ) ہو یا حزنیہ (رثائیہ) اس کی پہلی آغوش گوش ہے۔ اس کے پروان چڑھنے کے تمام تر مدارج شعبِ فکر میں وقوع پزیر ہوتے ہیں۔ ایک حقیقی شاعر باطن اور خارج کے توازن سے شعر کشید کرتا ہے اور ورطۂ اظہار کی بوقلمونی کے سپرد کردیتا ہے۔ مصرع گویانِ محض اور ردیف و قوافی کے بستہ بردار غلام میرا موضوع ہرگز نہیں ہیں۔ اظہار کی سلیقگی، مصارع کی پختگی، ارتباطِ لفظی، دروبستِ ہنر اور چھوئی موئی سی نغمگی کو شعر میں تجسیم کرنا ایک اصیل شاعر ہی کا منصب ہے۔ شعر اظہار کے قالب میں ڈھلنے سے قبل مشامِ دل و جاں سے معنی کشید کرتا ہے، ریاضت سے مضارب کرتا ہے، رتجگوں سے خمیازہ طے کرتا ہے، تب کہیں جا کر ''نظر آتی ہے اِک مصرعِ تر کی صورت۔''

شاعر کا وجدان محدود ہو تو شعر کا دامن محدود و متعین رہ جاتا ہے، انسانی تاریخ میں شعر گوئی کبھی صنفِ اختیار ہوا کرتی تھی مگر اب بنائے اظہار ہے، مادی ہو یا الوہی۔ موسیقیت انسانی تارِ نفس سے اس قدر مانوس ہے کہ پورا وجودِ انسانی مدھر جھرنے کی لے پر پروان چڑھتا ہے، غوں غاں آغوں کا سفر ''کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے'' کا سفرِ مراجعت

م۔م۔ مغل

طے کرتا ہے تو اظہار کی کائنات کم پڑنے لگتی ہے۔ اس تمام تر تنگ دامنی کے باوجود لیلائے شعروادب کے قتیلان کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوا ہے۔ ایسا ہی ایک اضافہ شبیر نازش ہے جسے اپنے گیسو سنوارنے کی مصروفیات میں لیلائے شعر کی زلفوں کے تار چھیڑنے اور مشاطگی کی لت نے اسیر کر رکھا ہے۔ جھاڑ کھنڈ، اڑیسہ، پٹیالہ، راجستھان، کشمیر، اتر پردیش سے جس طرح فلم انڈسٹری میں کسبِ ہنر آزمانے فنکار بمبئے آیا کرتے تھے اسی طرح شبیر نازش کو کراچی نے میاں چنوں سے رجھا کر اچھے دنوں کی نوید سنا کر اپنا اسیر کر لیا۔ لگ بھگ بیس سال سے شبیر نازش کراچی کی جمالیات کو طلسمِ معبدِ عشق جان کر وجد آور اور کیف آگیں مسرتوں میں مقید ہے۔

روزگارِ روز وشب میں سے لمحے چرانا اور الفاظ کے تار و پو کو شعر کی لڑیوں میں پرونا شبیر نازش کا واحد کام ہے جس میں اسے دوستوں کے بے جا نصیحت نامے جھیلنا پڑتے تھے۔ کوئی کیا کہتا ہے اس سے شبیر نازش کو فرق نہیں پڑتا، شبیر کو صرف اس بات سے فرق پڑتا ہے کہ وہ خود کیا کہتا، وہ خود کیا سمجھتا اور وہ خود کیا کہنا چاہتا ہے۔ بظاہر ہم اسے نرگسیت پر محمول کرتے ہیں مگر نفسیات کا طالب علم ہونے کے باوصف میں سمجھتا ہوں کہ شبیر نازش کی نرگسیت کہیں زندگی کے جمود میں توازن برقرار رکھنے میں اپنا آپ دریافت کرنے کی کوشش ہی نہ ہو۔۔۔ وقت جس قدر تیزی سے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہے اس سرعت میں اس سفر میں توازن برقرار رکھنا جمود ہی تو ہے۔ شبیر نازش کے شخصی وجود کا مطالعہ کرنے پر کھلتا ہے کہ یہ جمود اسے استغراقِ ذات اور انہماکِ ذات کے ساتھ ساتھ عرفانِ ذات کی جانب منتقل کر رہا ہے، کم از کم حالیہ پانچ سات برسوں میں شبیر نازش نے جن شعری معائیر کی جانب جست بھری ہے وہ میرے اس مقدمے اور محاکے کی تائید ہی میں ہے کہ شبیر نازش کی نرگسیت دراصل ذات کے جمود، ٹھہراؤ اور توازن ہی کے لیے تھی، اس ٹھہراؤ نے شبیر نازش کو عرفانِ ذات کی راہ پر مرکوز رکھا اور اب شبیر نازش اظہارِ ذات کے مرتبے پر فائز ہے۔ اظہار کی پیچیدگی ہو یا سہل نگاری یہ دراصل شخصی وجود، پرداخت اور ردعمل کا شاخسانہ ہوتی ہے۔ داخلی تفکرات اور خارجی حادثات انسانی اظہار کے آئینہ میں جوہرِ زنگاری کی طرح ہیں، یہی وہ وصف ہے جس سے ہم اظہار کار کو سمجھنے پرکھنے کا راستہ بنا سکتے ہیں۔

میری دانست میں شبیر نازش کا اولین شعری مجموعہ "آنکھ میں ٹھہرے ہوئے لوگ"، شخصی توازن کی کشاکش اور جمود کا مظہر ہے، وہی

جمود جو عرفان واستغراقِ ذات کی ذیل میں ہے، معبدِ ذات میں اعتکاف کے اس پورے عمل میں شبیر ناز ش نے داخلی مراقبہ اور خارجی تنہائی کا زہر اپنے رگ وپے میں سہولت سے اترنے دیا، مبادا آپ خیال کریں کہ شبیر اذیت پسند ہے مگر ٹھہریں، تنہائی اختیار کرنا تو قدری معاملہ ہے، جبری ہرگز نہیں۔۔۔ مستنصر حسین تارڑ کا فقرہ شاید اس راز کو آشکار کر سکے کہ" تنہائی کا زہر بہت جان لیوا ہوتا ہے، عام انسان یہ زہر جھیل نہیں سکتا اور جو یہ زہر جھیل جائے وہ عام انسان نہیں ہو سکتا"۔ یہ بات ہم سب تسلیم کرتے ہیں کہ شاعر عام آدمی نہیں ہوتا، پھر وہ بھی یا کمی کہاں کہ جس کی بنیاد پر ہم کسی شاعر کو دائرۂ خمول کا شاعر کہہ دیتے ہیں، جس بنیاد پر ہم کسی کو محدودات کا شاعر گردانتے ہیں۔ خمول تو خیر چیزے دیگر است مگر محدودات بھی تو اختیاری منصب ہی ہے، یہ محدودات کسی شاعر کو انفرادی راہ کی جانب ہی تو مبذول کرتی ہیں، اظہار انفرادی ہونا ویسے بھی کم لوگوں کے نصیب میں رہا ہے مگر احساس کی انفرادیت کو تسلیم کرنے میں کیا قباحت ہے۔ ہم کسی کے داخلی وجود کا نشتر زنی کے بعد بھی مکمل احساسی مطالعہ نہیں کر سکتے، یوں ہم کسی شاعر کے بارے میں دعویٰ بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شبیر ناز ش کے اولین مجموعے پر ناقدین شعر نے جس رعونت کا مظاہرہ کیا، انتقادیات کے نام پر جس تبحرِ علمی سے ایک شاعر کے لہو تھوکنے کے عمل کو صرفِ توہین کیا، شبیر ناز ش کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کب کا بددل ہو کر یہ راہ چھوڑ چکا ہوتا۔ شعری احیاث میں شبیر ناز ش نے کبھی ہماری بات نہیں مانی سو یہ ہنر اس کے کام آیا اور اس نے ہمت نہیں ہاری، بلکہ نئے ولولے کے ساتھ سفر میں تیزی اختیار کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ تبصرہ فرماؤں اور نقادوں کی جانب سے رد کر دینے کا توہین آمیز رویہ اس کی شخصیت کے گرد لپٹے ہوئے خول میں دراڑ کی وجہ بن گیا، شبیر ناز ش اب رائے کی قید سے مبرّا ہو چکا ہے، اسے اپنے بارے میں کسی ناقد کی پروا ہے نہ ہی توصیف نگاروں کی۔ خود میرے یہ معدودے چند کلمات بھی شبیر ناز ش کی توصیف میں ہرگز نہیں بلکہ اعتراف کی ذیل میں ہیں۔ اپنی داخلی، خارجی الجھائی ہوئی نفسیاتی گتھیوں کو سلجھانے میں شبیر ناز ش اپنے اطراف سے اکتا چکا ہے۔ داخلی توازن جو اندرونی شکست و ریخت کا شاخسانہ تھا جو زمانے کا نشانہ تھا اور اب ایک الگ طرح کے ٹھہراؤ میں پڑاؤ ڈال چکا ہے، یہ ٹھہراؤ نفس کا ہے، زمانے کا نشانہ شبیر ناز ش والہانہ نعرۂ مستانہ بلند کرنے میں حق بہ جانب ہے۔ اعتبارِ ذات میں غلطاں "ہم

تری آنکھ سے ہجرت نہیں کرنے والے"

مراجعت کے اس سفر میں شبیر نازش کے ہاں الگ نوع کے شعری اور اظہاری پڑاؤ نظر آتے ہیں، شبیر فراتِ سماعت، خیامِ اظہار اور کربلائے ذات پر مرثیہ خواں ہے۔ کوفۂ اعتراف اور دمشقِ رد اس کے شعر کا بنیادی لازمہ ہے۔ اشہبِ تخیل پر سوار اپنے ہم جلیسوں پر طائرانہ نظر دوڑاتا ہے اور برق رفتاری سے توسنِ اظہار کو ایڑھ لگا دیتا ہے، کربلائے ذات میں خود اپنی ذات ہی اس کے لیے نحر ہے۔ اس کارزار کے کچھ شعری مجادلے ملاحظہ ہوں۔

ہم بڑی عمر میں اے عشق! تری نذر ہوئے
کھل کے اِس عمر میں اِظہار نہیں ہو سکتا

.....

دل کسی شخص سے منسوب رہا، خوب رہا
آنکھ نے اشک گرایا تو مجھے یاد آیا

.....

اِک یاد اثر پذیر ہوئی اِس طرح کہ بس
دل کا نمک نکل کے نوالے میں آ گیا

.....

مَیں اپنا عشق پورا لکھ چکا ہوں
ادھورے رہ گئے ہیں باب تیرے

ہماری آنکھ میں وحشت نہیں تو پھر کیا ہے
ہمیں یہ ہجر غنیمت نہیں تو پھر کیا ہے

.....

ہماری ذات کے حجرے سے سرسری نہ گزر
ہمارے دکھ ہے میاں! دوسری طرح کے دکھ

.....

بس اِک خلا تھا خلائے بسیط و بے پروا
سکوت ٹوٹ کے بکھرا، مکالمات بنے

.....

وہی تھکن ہے سفر کی، وہی در و دیوار
اَٹا پڑا ہے مسافر مسافتوں سے اُدھر

.....

ہوں میں لپیٹ کر دیا اس نے مجھے جواب
اِنکار بھی نہیں کیا اِنکار کی طرح

.....

تجھ میں اِک وصف بہ ہر طور ہے دنیا سے الگ
تو اگر دوست نہ ہوتا مرا دشمن ہوتا

.....

مَیں آپ کے جمالیاتی ذوق اور تفہیمِ شعر پر مسلّط نہیں ہونا چاہتا، یہاں اشعار نقل کرنے سے میری مراد محض اتنی ہی ہے کہ شبیر نازش کو واجبی مانوسیت کے پردے ہٹا کر کچھ فاصلے سے دیکھا جائے۔

بہت بارش ہوئی اندر ہمارے
بہت سر سبز ہے صحرا ہمارا

.....

بیٹھے بیٹھے کسی کی یاد آئی
بیٹھے بیٹھے کسی سے مِل آئے

.....

ہوتا ہے کوئی اور ہی عالم سرِ عالم
لگتا ہے کہیں اور ہی دربار ہمارا

.....

کیا دیکھنے آتے ہیں سرِ وادیٔ مژگاں
آنسو مجھے احباب سے واقف نہیں لگتے

.....

مَیں سوچتا ہی رہتا ہوں نازش تمام شب
مصروفیت کو آج سے فرصت بناؤں گا

.....

شبیر نازش نے ذات کے نوحے کو نغز گوئی کے لباس سے آراستہ کرنے میں انگلیاں فگار کی ہیں، کسی خیاط کی طرح انگلی کے پور پور سوئی کے بوسے سے لبریز رکھے ہیں، دھاگے کے بجائے سانس کی تاریں کام میں لائی ہیں۔ شبیر نازش کے کھردرے وجود میں دور کہیں ننھا سا دل بھی دھڑکتا ہے، اس ننھے سے دل کو دھڑکنے کا عضو ہی خیال کیا گیا۔ میرے لیے شبیر نازش کے اشعار پر انتقادی رویہ اختیار کرنا بہت آسان تھا اور یہ کام گزشتہ بیس برس کی رفاقت میں بہ ہر طور مَیں نے کیا، تنقید کے تیشے سے شعر کے اصنام پر ضربت لگاتے ہوئے یکبارگی میں خیال آیا کہ چھینی اور تیشہ کسی پتھر کے بجائے ایک موی مجسمے پر ہے، یہی احساس مجھے ان سطور کے سپرد قرطاس کرنے پر مجبور و مامور کر گیا۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ روایتی تنقیدی معائیر کسی شہ پارے کے تحت تبدیل کیے جاتے ہیں، حرف و صوت کی اس صناعی میں شبیر نازش کو پڑھتے ہوئے آپ بھی محسوس کریں گے کہ بلند فلک شگاف چیخ کو حلق میں دبوچ لینے اور اظہار کی سطح پر موسیقیت اختیار کرنا کس قدر مشکل کام ہے، اسی مشکل عمل میں تفہیم کا زاویہ بدل کر شبیر نازش کی کیفیات میں شریک ہوں۔ شبیر نازش نے صرف غزلوں کے دامن کو ہی وسعت نہیں دی بلکہ نظم کو بھی اظہار کی راہ میں اختیار کیا، ڈی چوک میں عشق کی اوّلیں ساعت کو تقیر کے خدا سے وصول کرتے ہوئے ثمر نامے کی کلکاریاں رنگوں کی زبانی لکھنے میں سہے ہوئے فیصلوں پر ایک دن تفریق جمع تقسیم اور ضرب کرتے ہوئے شبیر نازش اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ تاریخ ہم پر ہنستی ہے۔ امر بیل کی بانہوں میں الفاظ ہم کلام ہوتے ہیں تو شبیر کے چہرے پر طمانیت کی وہ لہر دوڑ جاتی ہے جو کسی شاعر کے لیے تخلیقی سرشاری کا حاصل ہوتی ہے۔ تخلیق کی سرشاری میں تفہیم کی کارگزاری کے لیے آپ کو شبیر نازش سے اس کی نظموں میں مکالمہ کرنا ہوگا۔۔۔ کتاب کا ورق پلٹنے سے قبل شبیر نازش کے لیے بے پایاں مسرتوں اور دعاؤں کا مرقع۔

☆☆☆☆☆

ناصر بشیر کی سفر نامہ نگاری

پہلی پیشی اور حج بیتی پروفیسر ناصر بشیر کے سفر ناموں کی دو کتابیں ہیں۔ مجھے سفر نامہ نگاری کا چسکا ابنِ انشا سے پڑا پھر ''لبیک'' از ممتاز مفتی ہوتا ہوا تارڑ تک اور پھر بیگم اختر ریاض الدین، سے ہوتا شوق آوارگی تک پہنچا، لیکن وہ کہتے ہیں نا جس چیز سے تعارف ہو وہ ذائقہ ہمیش یاد رہتا ہے میرے ساتھ بھی ایسا ہوا ''لبیک'' کا مزا باقی رہ گیا، لہٰذا اب بھی جب کبھی دیارِ محمدؐ کا سفر نامہ ملے تو اسے بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ ناصر بشیر کی پہلی کتاب ''پہلی پیشی' ان کے عمرے کا اور حج بیتی حج کا سفر نامہ ہے۔ سفر نامے کی ایک ہی شرط ہے کہ لکھاری نے سفر کیا ہو، اس کے علاوہ مجھے سفر ناموں میں کوئی اور قدر مشترک نظر آئی ہے نہ ہی میں تلاش کر پایا ہوں۔ اللہ کی زمین جس قدر خوب صورت ہے اسی قدر انسان کی آنکھ میں حسن کی پرکھ کا مادہ موجود ہے، اسی قدر دیکھنے والی آنکھ کے پیچھے موجود شعور ولاشعور وتحت الشعور کی ہمہ ہمیاں جدا اور الگ ہیں۔ لکھاری کا مزاج، اس کا مذاق، اس کا رجحان، اس کا میلان غرض سوچنے کا انداز ہو کہ بات کرنے کا سلیقہ ایک سفر نامے ان سب عناصر کی نامیاتی کل سے ہر دوسرے سفر نامے سے الگ ومنفرد ہو جاتا ہے۔

مجھے سفر نامہ کی صنف نثر کا خیال جب بھی آتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہی صنفِ نثر شاعری کے بعد مقبول ترین رہی ہو گی کیوں کہ قصہ گوئی اور داستان نگاری میں اسی سفر نامے کی اولین صورت ملتی ہے، سفر وسیلہ ظفر کو اپنا ایمان کا حصہ ماننے والے آدم نے جب ایک جگہ سے دوسرے مقام کا سفر کیا ہو گا تو اس کے تجربہ اور مشاہدہ میں ایک تلاطم ضرور آیا ہو گا، گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والا عام آدمی تھوڑے ہوتا ہے لہٰذا سفر ایک ایسا موضوع ہے کہ جس میں کہنے اور لکھنے والے کو ڈھیر معلومات میسر آتی ہیں اور سننے والوں کو اپنے مقام پر رہتے سہتے غیر ملک کی معلومات اور خوش گوار باتیں سننے اور پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ ہماری داستانیں اور روایتی قصے کہانیاں

عادل سعید قریشی

ہی کیا ہماری لوک کہانیوں میں سفر اور سفر کی صعوبتوں کے علاوہ پردیس کی حیران کن کہانیاں اور رسم و رواج کا ذکر ملتا ہے لیکن سفرنامہ ان کو مانا نہیں جا سکتا، جب کہ سفرنامہ نگاری اک الگ فن ہے، اس کے الگ تقاضے ہیں۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل نے لکھا ہے کہ سفرنامہ اس اعتبار سے ادبیات کی ایک مفید صنف ہے اس سے معاشرے کی تاریخی و جغرافیائی، مذہبی و تہذیبی اور معاشرتی و سیاسی حالات کا علم ہوتا ہے۔ اس سے اکثر تاریخیں مرتب کی گئی ہیں اور جغرافیہ کے بہت سے نقشے دست یاب ہوئے ہیں، اچھے سفرنامے میں انسانی علوم کے مطالعے کے وافر امکانات پائے گئے ہیں، کسی ملک کے اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالات کا اندازہ سفرناموں سے خوبی کے ساتھ لگایا جا سکتا ہے، یہ افراد کے جذبات کی تشکیل اور ان کے ذوق کی اصلاح پذیری کو تیز کرنے میں مدد بھی دیتے ہیں۔

ناصر بشیر گورنمنٹ دیال سنگھ کالج لاہور میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں، اردو زبان و ادب کے نیک نام مدرس اور منجھے ہوئے شاعر اور سنجیدہ انشا پرداز ہیں۔ ان کا پہلا سفرنامہ "پہلی پیشی" ۲۰۱۶ء میں شایع ہوا اور ۲۰۱۸ء میں طبع ثانی ہے، یہ دراصل عمرہ بیتی ہے، مصنف لکھتے ہیں "پہلی پیشی، کا پہلا باب لکھنے کی سعادت مجھے خانہ کعبہ اور حجر اسود کے سامنے بیٹھ کر حاصل ہوئی۔" دوسرا سفرنامہ حج بیتی ہے، حج بیتی، بھی ایک حقیقت پسند انسان کے جذبات و احساسات کی کتھا ہے جو اپنی خوش بختی کے اس سفر کو ذہنی طور سے قبول کرنے میں تامل کا شکار ہے لیکن اس دربار میں حاضری کا پروانہ مل جانے پر سراپا سپاس ہے، خوش بختی اور یا بدبختی انسان اس کے لیے توجیہہ کی تلاش بنارہ نہیں پاتا۔ ناصر بشیر ایک حقیقت شناس انسان ہیں لہٰذا انھوں نے اپنے ان دنوں سفرناموں میں اپنے مشاہدے، تجربے اور دل پر مرتسم ہونے والے ہر ہر احساس اور جذبے کو بے پناہ سادگی اور شائستگی سے یہاں قلم بند کر دیا، ان کے یہ دونوں سفرنامے اپنی سادہ بیانی اور اخلاص کے سبب قاری کی حظ اندوزی کا سبب بنتے ہیں۔ سفرنامہ کے حوالے سے مجھے جس بات نے متاثر کیا وہ ناصر بشیر کا اسلوب انشا ہے۔

اسلوب ہی وہ حوالہ ہے جو کسی بھی تخلیق کار کو اپنے جیسے دوسرے تخلیق کاروں سے منفرد کرتا ہے، فرد ہونے کا یہی احساس اور جذبہ خود تخلیق کار کی تمنا بھی ہوتی ہے اور ساتھ ہی یہ فردیت اس تخلیق کار کا فنی منتہا بھی ہے، گو اسلوب کے تمام اجزائے ترکیبی کو نہ تو گنا جا سکتا ہے اور نہ ہی یہ گنتی اپنی اقتنا ہی صورت کے سبب مکمل ہی ہو پاتی ہے۔ ماہرین اسلوب نے اس لیے کچھ اجزائے ترکیبی کو جزو لاینفک قرار دے کر نقادین اسلوب کے لیے سہولت کا سامان کر دیا لیکن اس کے باوجود کسی بھی ایک جز کو اساسی یا چند اجزا کو کلیدی قرار دینا

ممکن نہیں سو ماہرین اسلوب کا ماننا یہ ہے اسلوب کا ہر ہر جزو اس ادیب یا شاعر کو منفرد کرتا جاتا ہے لہٰذا جیسے انسانوں کی صورتیں اور طبائع میں اختلاف ہے اسی طرح تخلیق کار ایک ہی صنفِ شعر و نثر کے باوجود خود کو دوسرے تخلیق کار سے فرد کرتا جاتا ہے کہیں یہ کام شعوری ہے تو کہیں لاشعوری، کہیں یہ کام مجبوری ہے تو کہیں یہ کام ذوق۔ لہٰذا ناصر بشیر کے اسلوب کی طرف گریز کرتے ہوئے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ مجھے ان کے سفرناموں کو پڑھتے سے جو چند اجزا نہایت نمایاں نظر آئے ہیں، ان کو مذکور کیے دیتا ہوں اس اعتراف کے ساتھ کہ یہی چند خصائص ان کی نثر کا احاطہ نہیں کیے ہوئے ۔ ناصر بشیر کے دونوں سفرنامے سرخیوں میں بٹے ہوئے ہیں ۔ اقتباسات کے بجائے انھوں نے سرخیوں کی مدد سے اپنے سفرناموں کو لکھا ہے جس سے پڑھنے والی دل چسپی کا گراف ہر ہر سرخی کے ساتھ اوپر ہی اٹھتا رہتا ہے۔

مجھے ناصر بشیر کی نثر نگاری میں ان کی زبان کی چاشنی کا عنصر سب سے زیادہ متاثر کرتا دکھائی دیا، ناصر بشیر نے نہایت سادگی اور سلاست سے ان سفرناموں کو ضبطِ تحریر کیا اور یہ بھی کہ ناصر بشیر کے زیرِ مطالعہ دونوں سفرنامے اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک پس منظر رکھتے ہیں لیکن دونوں کا ماحول اور ذہنی تجربہ کلیتاً جدا تھا اس لیے عمرہ و حج میں جو جو روحانی کیفیات ناصر کے دل پر وارد ہوئیں ان کو انھوں نے اسی انداز سے لکھ ڈالا، پہلی پیشی میں صاحبِ سفر عمرہ پر تھا اور عمرہ کا ماحول اور تقاضے چونکہ حج سے الگ ہوتے ہیں اس لیے حج بیتی کا انداز بیان اور پیش کش میں ایک الگ الوہیت اور رعب جمال کا احساس ہوتا ہے لیکن زبان دونوں کی رواں، سادہ اور تخلیقی حسن سے مالا مال ہے۔ یہاں یہ بات بھی مجھے کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ناصر بشیر کو اپنے قاری کی ذہنی سطح اور اس کے فہم کے درجے کا کمال اندازہ ہے انھوں ان سفرناموں کو کوئی دینی کتاب اور فقہ یا تصوف کی دستاویز نہیں بنایا انھوں ان کتابوں میں خود کو مرکز مان کر عام آدمی کے احساسات کو ملحوظ رکھا اور جو جو کچھ انھوں نے دیکھا، اس کے ساتھ اس جگہ کا مختصر تعارف و تاریخ بیان کر دی ہے۔ اس ے ساتھ انھوں نے یہ بھی اہتمام کیا جو وہ خود محسوس کر رہے ہیں اس کو آسان زبان میں ثقیل تراکیب اور اصطلاحات کے سوا پیش کر دیں۔ سفرناموں کی لفظیات کے بارے میں یہ کہوں گا کہ انھوں نے اپنے سفرناموں کو عوام کے لیے لکھا ہے اور اس بات کا پتا یوں چلتا ہے کہ انھوں نے سلاست اور سادہ بیانی کا التزام برتا ہے۔

دوسرا بڑا وصف ناصر بشیر کے سفرناموں میں یہ ملتا ہے کہ وہ اپنے ان سفروں میں جس قدر خود محظوظ ہوئے ہیں، اسی قدر اپنے قاری کے لیے بھی حظ اندوزی کا سامان کیا ہے، انھوں نے پہلی پیشی ہو کہ حج بیتی، دونوں میں وہ اپنے قاری کے گائیڈ بنے نظر آتے ہیں، پروفیسر ناصر بشیر حشو و زوائد کا گہرا احساس رکھنے کے باوصف اپنے قاری کو

پہلے صفحے سے اپنے ساتھ رکھا ہے اور خوب خوب سیر کرائی ہے۔ ان کا ساتھ ایسے ہی ہے کہ جیسے آپ خود ان کے ساتھ ہوں اور ایک ایک مقام، ایک ایک جگہ، ایک ایک موڑ، ایک ایک زیارت ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ پا رہے ہوں۔ پہلی پیشی ہو کہ حج بیتی، کوئی ایسا لمحہ نہیں اور کوئی ایسا مرحلہ نہیں جہاں ناصر بشیر اپنے قاری کو ساتھ لیے نہ پھرا ہو۔ سفرنامے کی جو تعریف ہے کہ اس میں صرف حالات وواقعات ہی بیان نہیں کرنے ہوتے بلکہ سفرنامے میں تو سفرنامہ نگار ادبیت کی شان سے اپنے قاری کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے، بالفاظ دیگر سفرنامے کا اصل حسن اس کی ادبیت ہی ہوتی ہے نہ کہ نری معلومات اور جغرافیے کا بیان۔ ناصر بشیر کی سفرنامہ نگاری ادبیت کی حامل ہے۔ یہ بھی اہم بات ہے کہ سفرنامہ نگاری صرف اس خطے کا احوال ہی نہیں بیان کرتا بلکہ اس سفر اور اس علاقے کا نقطۂ اتصال بن کر اپنے اپنے سفرنامے میں سامنے آتا ہے۔ رئیس احمد جعفری کا کہا صائب ہے کہ سفرنامہ علمی وادبی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے، یہ واحد صنف ادب ہے جس کا تقریباً تمام اہم معاشرتی علوم سے گہرا تعلق ہے۔ مؤرخوں، سوانح نگاروں اور جغرافیہ دانوں نے اس صنف سے بہت فائدہ اٹھایا ہے اور اسی وجہ سے دنیا کی تمام بڑی چھوٹی زبانوں کے ادبیات میں سفرناموں کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ناصر بشیر کے یہ دونوں سفرنامے اس وصف کے مطابق مثالی سفرنامے قرار پائیں گے۔ پروفیسر ناصر بشیر کے یہ سفرنامے اپنے عہد کے نمائندہ سفرنامے اس لیے بھی ہوں گے کہ ناصر بشیر نے تصنع و بناوٹ سے کام نہیں لیا وہ اپنے ان سفرناموں میں اپنے اصلی چہرے اور اپنی حقیقی طبیعت کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔

اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ ناصر بشیر کے سفرنامے اردو اسفار ناموں میں بلاشبہ بہترین اضافہ ہیں اور یہ سفرنامے چونکہ مذہبی سفرناموں میں گنے جائیں گے اس لیے ان کا مزاج اسلامی ہے اور اسلام کے ہی بنیادی عقائد اور تاریخی مقامات کی معلومات اور اسلامی شعار کا ذکر ملتا ہے، اس کے ساتھ خود مصنف کے جذب وکیف کا حال بھی بیان ہوتا ہے، جگہ جگہ مصنف اپنی خوش قسمتی کو بیان کرتے ہوئے ان مقامات مقدسہ میں اپنی حاضری پر رب اللعالمین کا شکر ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے ملنے والوں، خرید وفروخت کرنے والوں، ڈرائیوروں، احباب کی کردار نگاری پر بھی توجہ دی ہے، وقائع نگاری کا بھی حق ادا کیا، جگہ جگہ شاعرانہ مزاج پر اپنے قاری سے داد بھی وصول کیے جاتے ہیں۔ یہ دونوں سفرنامے دراصل اپنے تخلیق کار کے علاوہ اپنے جغرافیے کے سبب سے بھی بہت سی مشابہتیں رکھتے ہیں۔ حج بیتی مجھے تو پہلی پیشی کا ہی سیکوئل لگا ہے، لیکن حج بیتی میں حج کے رکن کا رعب اور دبدبہ جا بجا دکھائی دیتا ہے اور ناصر بشیر کی انشا دونوں سفرناموں میں اپنی الگ شان اور رعب کے لیے داد خواہ ہے۔

☆☆☆☆☆

فیصل زمان چشتی ___ ایک حساس اور دلگداز شاعر

عمر سپنوں کی ہے لیکن یہ ذرا دھیان رہے
دل مسافر کہیں رستوں میں نہ مارا جائے

.....

فیصل زمان چشتی حلقہ ارباب ذوق پاک ٹی ہاؤس لاہور کے جوائنٹ سیکرٹری کے طور پر جس خوش اسلوبی سے اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں وہ یقیناً قابل رشک اور قابل تحسین ہے۔ ان کی شخصیت کے صوفیانہ پن کی کشش و تاثیر ہی ہے جو ہر آنے والے کو نہ صرف اپنا گرویدہ بناتی ہے بلکہ ادب بمعہ ادب کا حقیقی راستہ بھی دکھاتی ہے۔

جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ انسان کی شخصیت کا عکس اس کے خیالات اور شاعری میں بھی نظر آتا ہے اسی طرح فیصل زمان چشتی کے اشعار میں بھی صوفیانہ رنگ اپنے پورے جمال و کمال کے ساتھ نظر آتا ہے اور ان کے تیسرے شعری مجموعے ''ہجر کو بخشی دھڑکن'' میں یہ رنگ و آہنگ جا بجا نظر آتا ہے۔

دو اشعار دیکھیے:

سراپا عجز بنوں وہ کمال دے مجھ کو
مرے خدا ذرا ایسے اُجال دے مجھ کو

عطا ہو خاک مدینہ جبین کو میری
درِ حبیب کی نسبت کی شال دے مجھ کو

.....

ان کی شاعری میں خوف خدا اور عشق نبیؐ ان کی ذات کے اندر پنہاں تصوف اور مودتِ رسولؐ کو بیان کرتا نظر آتا ہے محمدؐ اور آلِ محمدؐ کے لیے عزت و تکریم و تعظیم ان کے خمیر میں شامل ہے اور ان کی نعت کے مصرعوں میں نعت کے وہ تمام تقاضے پورے ہوتے نظر آتے ہیں جو نعتِ رسولؐ مقبول کا خاصا ہوتے ہیں۔

معیار اور شعری حساسیت میں رچی بسی حمد

طلحہ غفور

ونعت اور منقبت کہنے کے لیے مطالعہ تخلیقی وفورِ مشقِ سخن اور نظریے سے وابستگی ازحد ضروری ہے جو ان کے پاس موجود ہے۔

فیصل زمان چشتی فنِ شاعری، علمی بصیرت تاریخ سے واقفیت سمیت اہل علم سے ارادت متناسب محتاط عقائد کے ساتھ چلتے چلتے عقیدت اور محبت کی راہوں سے گزرتے ہوئے اشعار کہتے ہیں جو دل میں عشقِ رسول کی لہروں میں مد و جذر پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

نعت کے دو اشعار دیکھیے:

کتنے وہ مہربان ہیں مجھ رُوسیاہ پر
ان کو قبول ہوں میں خطاؤں کے ساتھ ساتھ
عرفان ذاتِ احمدِ مختار تب ملے
جب ہم چلیں درود کی چھاؤں کے ساتھ ساتھ

.....

ان کی شاعری سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حالات پر رنجیدہ اور دکھی بھی ہیں مگر اس دکھ میں ڈوبنے کے بجائے وہ اس دکھ اور کرب کو اپنی طاقت میں تبدیل کرنے کا فن بھی جانتے ہیں وہ دُکھوں اور غموں کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتے بلکہ ان کا مقابلہ کر کے ان کو تہِ تیغ کرنے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں دہجر و فراق جیسی اذیت اور تکلیف دہ کیفیت کو بھی اپنے عزم صمیم اور قلبی ریاضت سے سرشاری میں بدل دیتے ہیں۔

ایسے حالات کو بیاں کرتے ہوئے دو اشعار دیکھیے:

مُفلسی کی نہیں تکلیف نہ بیماری کی
میرا دُکھ یہ ہے کہ بچوں سے اداکاری کی
دُکھ نہ تیغ کیے ہجر کو بخشی دھڑکن
اپنی جاگیر میں ہم نے بڑی سرداری کی

.....

ان کی شاعری کا اولین حوالہ دکھ اور غم ہے اس پیرایۂ اظہار میں کسک، درد اور اُلجھن کا عنصر نمایاں اور غالب ہے ان کی شاعری میں ہجر کا اظہار یہ زیادہ ملتا ہے وصل کی صورت کم کم دکھائی دیتی ہے۔

فیصل زمان چشتی اپنی شاعری میں زندگی کے تلخ حقائق پورے شعری رچاؤ اور فنی مہارت کے ساتھ بڑی سہولت سے بیان کر گئے ہیں انھوں نے اشعار میں زندگی کی لاچاری اور حالات میں بے رحمی کو اپنے مخصوص اور خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے۔ ان کے اشعار میں اس قدر خوبصورت ہیں کہ قاری کے دل میں سیدھے ترازو ہو جاتے ہیں اور بڑی دیر تک قاری ان اشعار کی کیفیت سے باہر نہیں آ سکتا اور یہی ان کی شعری سچائی ہے۔

ان کی شاعری میں مصرعوں کی بُنت، خیال آفرینی، ابہام سے پرہیز، خوبصورت اور منفرد تشبیہات و استعارات کا استعمال،

قطعیت، موضوعات کا تنوع اور منفرد اسلوب ان کی شاعری کو مضبوط اور توانا کرتا ہے۔

کوئی بھی شاعر اپنے اردگرد سے صرف نظر نہیں کرسکتا وہ اپنے معاشرے اور سماج کے حالات پر گہری نظر رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے عصری مسائل سے بخوبی واقف ہیں اور بڑی سادگی اور روانی سے سیاسی انتشار معاشی بدحالی اور تکلیف دہ مہنگائی جیسے کربناک موضوعات کو اشعار کے قالب میں ڈھالتے ہیں تو عام آدمی کی آواز بن جاتے ہیں۔

اس ضمن میں ان کے دو اشعار دیکھیے:

تو نے بھی دولتوں کا بڑا لطف لے لیا
ہم نے بھی اپنے حصے کی لی ہے گزار بھوک

ایوانِ اقتدار سے باہر نکل کے دیکھ
پھرتی ہے کیسے گلیوں میں دیوانہ وار بھوک

.....

وہ نفرت کا جواب نفرت سے دینے کے عادی نہیں بلکہ اس کے بدلے میں اخلاق اور بردباری کا درس دیتے نظر آتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ معاشرے میں محبت یگانگی اور ہم آہنگی کے لیے نفرتوں کو کچلنا ہوگا اور رواداری کو فروغ دینا ہوگا تبھی ہمارا معاشرہ صحیح معنوں میں معاشرے کہلانے کا حق دار ہوگا۔ دو اشعار دیکھیے:

درد سہنے سے ہی احساس توانا ہو گا
بات ہے حوصلے کی اور عملداری کی

پھول بھیجے ہیں اُسی شخص کو پھر بھی فیصل
جس نے ہر لمحہ مخالف کی طرفداری کی

.....

ان کی شاعری روایت سے جدت کی طرف سفر کرتی دکھائی دیتی ہے جو کہ بہت قابل تحسین ہے ان کی شاعری میں کسی بھی موضوع پر شعری کیفیت کہیں بھی مجروح ہوتی دکھائی نہیں دیتی ہے اور اک کو خیرات ملتی ہے اور حیرتوں کے نئے در وا ہوتے ہیں۔

ایک خوبصورت غزل کے دو اشعار دیکھیے:

شہر چھوڑا ہے مضافات میں آ بیٹھے ہیں
چھت کے ہوتے ہوئے برسات میں آ بیٹھے ہیں

جب سے روٹھا ہے پرندے بھی شجر چھوڑ گئے
اس سے بچھڑے ہیں تو اوقات میں آ بیٹھے ہیں

.....

بطور طالب علم ایک مختصر مضمون میں کتاب کا فکری و فنی جائزہ ناممکن ہے تاہم ان کی شاعری کسی بھی ادبی لگاؤ رکھنے والے قاری کو تادیر سحر میں رکھنے کے لیے کافی ہے، جس کے حصار سے نکلنے کے لیے ایک عمر درکار ہے۔

میں فیصل زمان چشتی صاحب کو اس خوبصورت مجموعے کی اشاعت پر ڈھیروں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

علی رضا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایک ہمہ جہت شخصیت

علی رضا سے میرا تعلق تقریباً میں سال سے ہے۔ ساہیوال میں ملازمت کے سلسلے میں جانا ہوا تو سب سے پہلے ان کے حلقۂ احباب میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ میں نے شعروادب اور ادبی تقریبات کے حوالے سے ان سے زیادہ متحرک شخص اور کسی کو نہیں دیکھا۔ تعلقاتِ عامہ کا افسر میں تھا مگر اس شعبے میں مہارت علی رضا کو حاصل تھی۔

ساہیوال کی وجہِ شہرت مجید امجد ہیں مگر اس شہر کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے جعفر شیرازی، حاجی بشیر احمد بشیر، پروفیسر ریاض حسین زیدی اور علی رضا جیسی نابغہء روزگار ادبی شخصیات کو جنم دیا۔

علی رضا شاعر بھی ہے، کالم نگار بھی ہے، نعت گو بھی اور خوش الحان نعت خواں بھی ہیں۔ انہوں نے شعروادب کے شعبے کو متعدد گرانقدر تخلیقات سے نوازا ہے۔ جن میں اُن کا شعری مجموعہ ''مفہوم''، نعتیہ مجموعہ ''ثنائے سرورؐ'' نعتیہ انتخابِ شاعری ''درود اُن پر سلام اُن پر''، انتخابِ سلام ''ہمارے ہیں حسینؓ''، ''مردِ خود آگاہ'' (سید تجمل عباس شمسی خاکے، کالم اور مضامین)، اردو نعتیہ شعری مجموعہ ''توصیفِ پیمبرؐ'' اور پنجابی نعتیہ شاعری کا مجموعہ ''پھلاں دی مہکار مدینے'' شامل ہیں۔۔۔۔

''ثنائے سرورؐ'' کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نعتیہ مجموعے کو بہ یک وقت صوبائی اور قومی سیرت ایوارڈ مل چکے ہیں۔۔۔ قومی سیرت ایوارڈ انہوں نے 2015 میں صدرِ مملکت سے وصول کیا۔ جب کہ اُن کے دوسرے اردو نعتیہ شعری مجموعے ''توصیفِ پیمبرؐ'' کو بھی حکومتِ پنجاب کی طرف سے صوبائی سیرت ایوارڈ عطا ہو چکا ہے ۔۔۔

''درود اُن پر سلام اُن پر'' کو 1999 میں محکمہ تعلیم نے تمام لائبریریوں کی زینت بنانے کی منظوری بھی دی بعد ازاں اس انتخاب کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا جس میں احمد ندیم قاسمی، نابش دہلوی، ڈاکٹر خورشید رضوی، عاصی کرنالی، اور دیگر اہلِ قلم کی آرا بھی شامل ہیں۔۔۔۔۔

فنِ نعت خوانی میں علی رضا کا نام بین الاقوامی

ذکاء اللہ انجم ملغانی

اہمیت کا حامل ہے اور انہیں اس سلسلے میں کئی بین الاقوامی ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔۔۔
گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد میں ''علی رضا کی ادبی خدمات'' کے موضوع پر ایم فِل کا مقالہ بھی لکھا جا چکا ہے۔۔۔
علی رضا کا کلام اب تک فنون، اوراق، محفل، تخلیق، ادب لطیف، ماہِ نو، شام و سحر، غالب، معاصر، زربفت، رجحانات، دستکیر، تحریریں، معیار، ادب دوست، انہماک، نیرنگِ خیال، ادبیات، تجدید نو، سیارہ، ارژنگ سمیت صفِ اول کے بہت سے جرائد و رسائل میں شائع ہو چکا ہے۔۔۔ اُن کے کالموں اور مضامین کو بھی کتابی شکل دی جا رہی ہے۔۔۔
اُن کی ایک نعت کے چند اشعار نذرِ قارئین ہیں۔۔۔

اُس درِ پاک پر دعا کے بغیر
نعت ہوتی نہیں عطا کے بغیر

آسماں، آسماں نہیں لگتا
وسعتِ جلوۂ حرا کے بغیر

جس دل میں اُترنے لگتا ہے
آپ کے شہر کی ہوا کے بغیر

.....

علی رضا اردو ادب کی اہم صنف غزل کے معتبر اور نمائندہ شاعر ہیں:
اُن کی غزل کا شعر پیشِ خدمت ہیں۔۔۔

کچھ خواب ہیں آنکھوں سے نکالے نہیں جاتے
آنسو نکل آتے ہیں سنبھالے نہیں جاتے

ایک اور غزل کا شعر ہے:

مرا یوں ہر گھڑی مصروف رہنا
کسی کو بھول جانے کے لئے ہے

غلام عباس کی گائی ہوئی ایک اور غزل کے اشعار:

آنکھوں کو تھا جو ذوق تماشا نہیں رہا
دل بجھ گیا ہے کوئی تقاضا نہیں رہا

یہ سانحہ بھی کم تو نہیں ہے کہ تیرے بعد
کوئی بھی تیرے شہر میں اپنا نہیں رہا

.....

غزل کی گائیکی کے مشہور اور پرائڈ آف پرفارمنس گلوکار اعجاز قیصر نے علی رضا کی غزل کو گایا تو اسے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بھرپور پزیرائی ملی:

لمحے ہجر وصال کے
رکھنا یار سنبھال کے

اپنے اپنے رنگ ہیں
ہر اک صاحبِ حال کے

بے مصرف ہے زندگی
اُس کی یاد نکال کے

.....

علی رضا کو اپنی والدہ سے بہت پیار تھا۔ والدہ کے انتقال کے بعد اُنہوں نے ''ماں'' کے حوالے سے تین سو سے زائد اشعار کہے ہیں۔۔۔

ماں کے قدموں کو چومنے کا عمل
کس بلندی پہ لے گیا ہے مجھے

اور کہتے ہیں کسے روز قیامت کا رضا
ماں کا جانا بھی قیامت سے کوئی کم تو نہیں

ماں کی خدائی بھی مجھے تنہا نہ کر سکی
اشکوں کا اک ہجوم مرے ساتھ ساتھ ہے

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

وزیرِ اعلیٰ نے حیران کن نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ چیف سیکرٹری کے استدلال کو تقریباً رد کر چکے تھے۔ بولے "شاہ صاحب! میں تو چاہتا ہوں کہ آپ کمشنر چھوڑ چیف سیکرٹری لگیں۔ میں آپ کی کارکردگی سے بہت خوش ہوں۔ مجھے پنجاب میں آپ کی طرح کے افسر چاہئیں۔"

میں نے کہا "مجھے رحیم یار خان میں چار سال ہو چکے ہیں۔ نیا کمشنر میری موجودگی میں آرام سے کام نہیں کر سکے گا اس لئے بہتر ہوگا کہ آپ مجھے بدل دیں۔"

سب نے مجھ سے اتفاق کیا۔ چودھری نثار نے کہا کہ آپ پنڈی آ جائیں۔ میں نے

معذرت کر لی۔ تلہ گنگ پنڈی سے قریب ہے۔ ساری برادری نے عملاً ڈی سی ہاؤس میں ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ میاں صاحب نے پوچھا کہ میں کہاں جانا پسند کروں گا۔ ''ملتان'' میں پہلے سے سوچ کر آیا تھا۔ میاں صاحب نے سیکرٹری جی ایم سکندر کو حکم دیا کہ ڈی سی ملتان چار گھنٹوں میں چارج چھوڑ دے۔ ڈی سی ملتان خیر سے برادرم بشیر حسین طاہر تھے جن کے قصے سارے پنجاب میں زبان زد خاص و عام تھے۔ جی ایم سکندران کے لئے سافٹ کارنر رکھتا تھا۔ مسکرا کر کہتا ''دراصل میں اس سے ڈرتا ہوں۔ اتنا بڑا پراپوگینڈسٹ تو پنجاب میں پیدا ہی نہیں ہوا۔''

وہ کہنے لگا ''فیصل آباد خالی ہے۔ اگر حکم دیں تو اس کو وہاں بھیج دیں۔ ''بھیج دو'' کہہ کر انہوں نے بات ختم کر دی۔''

ملتان کی اہمیت: ملتان ضلع کا انتخاب میں نے سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ بلوچستان اور پھر رحیم یار خان میں چار سال گزارنے کے بعد مجھے جنوبی پنجابی سے اُنس سا ہو گیا تھا۔ چاہتا تو لاہور، پنڈی، فیصل آباد کا انتخاب کر سکتا تھا۔ ملتان نہ صرف جنوبی پنجاب کا Nerve Center ہے بلکہ اسے ہمیشہ سیاسی، معاشی اور کلچر کے اعتبار سے خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ محمد بن قاسم یہاں زیادہ دیر ٹھہر تو نہ سکا لیکن اس کی دھرتی نے عربوں کے رہن سہن کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا اور کسی حد تک اثر بھی قبول کیا۔ مغلوں کے زمانے میں بھی مشہور تھا کہ جس کا ملتان مضبوط ہے اُس کا دلی مضبوط ہے۔ کسی زمانے میں یہ برصغیر کے چند بڑے اضلاع میں سے ایک تھا۔ اس کی حدیں جھنگ، ساہیوال اور ڈیرہ غازی خان تک پھیلی ہوئی تھیں۔ خانیوال، وہاڑی اور لودھراں اس کی تحصیلیں تھیں بعد میں ضلعے بن گئیں۔

جب میں نے چارج لیا تو لودھراں ملتان کا آخری سب ڈویژن تھا۔ مرکزی اور صوبائی حکومت میں اس کے باسیوں کو ہمیشہ اہم مناصب ملے۔ نواب صادق قریشی وزیر اعلیٰ اور گورنر پنجاب رہے۔ مخدوم سجاد قریشی گورنر پنجاب رہے۔ ان کے بیٹے شاہ محمود نے ایک طویل عرصہ تک وزارت کے مزے لوٹے۔ یوسف رضا گیلانی، وزارتوں کو پھلانگتے ہوئے بالآخر وزیر اعظم پاکستان بن گئے۔ گیلانیوں اور قریشیوں میں ایک طویل عرصہ تک ان بن اور سیاسی چپقلش رہی۔ دونوں خاندان اپنے اپنے رنگ میں روحانی پیشوا رہے۔ ایک ایسا وقت تھا کہ مرید گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر ووٹ بھی دیتے تھے اور نوٹ بھی نچھاور کرتے تھے۔ حامد رضا گیلانی کے والد علمدار حسین گیلانی نے ضلع کونسل کے الیکشن میں ملتان کے مشہور ڈپٹی کمشنر Sir Adward

Panderal moon کو ہرا دیا تھا۔ مون بھی ضلع کونسل کی چیئرمینی کا اُمیدوار تھا۔ مون بلاشبہ ہندوستان کا بہترین ڈپٹی کمشنر تھا۔ وہ ۱۹۳۴ء سے لے کر ۱۹۳۷ء تک ملتان میں ڈپٹی کمشنر رہا۔ ڈی سی ہاؤس کا بیشتر فرنیچر اُس نے اپنے ہاتھ سے بنایا کیونکہ یہ اس کی ہابی تھی۔ اب بھی لاؤنج میں ایک بہت بڑا میز پڑا ہے جو اس کی یادگار ہے۔ تقسیم کے بعد وہ صرف ایک بار ملتان آیا۔ ڈی سی ہاؤس گیا اور کافی دیر تک اس میز پر لیٹا رہا اور اُسے چومتا رہا۔ ایک افسر کے خط کے جواب میں اس نے لکھا "میں جب دورے پر جاتا تھا تو گھوڑے پر بیٹھ کر دن میں پچاس میل کا سفر کرتا، ہر تھانے میں جاتا، تمام رجسٹروں کی پڑتال کرتا، تھانیدار سے لاء اینڈ آرڈر پر گھنٹوں تبادلہ خیالات ہوتا اور تھانے میں ہی لوگوں کی عرض داشتیں بھی سنتا۔ محکمہ مال کی مد میں کبھی پٹواری کی مدد نہ لی۔ لٹھے سے خسرہ نمبر تلاش کرتا اور مطلوبہ زمین کے کنارے پر کھڑا ہو کر گرداوریوں کی پڑتال کرتا۔

Although I was known as a harsh officer but I always protected police from the excesses of judiciary.

اس کی یادداشت کا یہ عالم تھا کہ کسی ضلعے میں اس نے اپنے سپرنٹنڈنٹ کو بدعنوانی کے الزام میں برخاست کر دیا۔ اس کا بیٹا جب سی ایس پی بنا اور لندن ٹریننگ کے لئے گیا تو وہ اپنے باپ کی صفائی دینے ای پی مون کو ملا۔ وہ غالباً اسے بتانا چاہتا تھا کہ مون نے جلد بازی سے کام لیا تھا اور اس کا باپ بے قصور تھا۔ مون بڑے تحمل اور غور سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ جب وہ صفائی دے چکا تو مون نے اُسے کہا۔ مسٹر وقار رستم بخشی، میں نے تمہاری باتوں کو غور سے سنا ہے۔ مجھے وہ تمام واقعات آج بھی ذرا ذرا یاد ہیں۔ میں نے تمہارے باپ کو انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ڈسمس کیا تھا اور آج تک میں اپنے اس فیصلے پر قائم ہوں اور میرا ضمیر کسی قسم کی خلش محسوس نہیں کرتا۔ علمیت اس قدر تھی کہ اس نے ہندوستان پر قریباً دو ہزار صفحوں کی ضخیم کتاب British conquest and dominions of India لکھی ہے۔ اس پائے کی کتاب کوئی ہندوستانی یا انگریز نہیں لکھ سکتا۔ وہ ضلع کونسل کی چیئرمینی کا الیکشن تو ہار گیا تھا لیکن کبھی بھی اس کو ذاتی انا کا مسئلہ نہ بنایا۔ اگر چاہتا تو گنتی کے ممبروں کو کان پکڑوا کر ووٹ حاصل کر سکتا تھا۔

ملتان کے ایک ڈپٹی کمشنر ملک کرم داد خان بھی تھے۔ تھے تو پی سی ایس لیکن سی ایس پی بھی ان سے خم کھاتے تھے۔ ان کا اصول تھا کہ دفتر کے

بعد نہ کسی کو گھر ملتے، نہ فون سنتے اور نہ کسی کی دعوت قبول کی۔ سرِشام ہی مورچہ بند ہو جاتے اور صبح تک کسی کو درشن نہ کراتے۔

ابدالی روڈ پر واقع ڈی سی ہاؤس دیدنی ہے۔ گو رقبہ خاصا گھٹ گیا ہے لیکن رومن طرز کے ستونوں پر کھڑی یہ عمارت آج بھی اپنی عظمت کی گواہی دے رہی ہے۔ گھر کا ڈرائنگ روم اتنا بڑا ہے کہ اس میں ایک گھر بن سکتا ہے۔ گھر سے ملحقہ زمین لے کر ایک نئی عمارت کھڑی کی گئی ہے جسے میرے وقت تک بطور گیسٹ ہاؤس استعمال کیا جاتا تھا۔ اس میں بالکل نیا اور ماڈرن فرنیچر ڈالا گیا تھا۔ گویا ڈی سی ہاؤس قدیم اور جدید کا حسین امتزاج تھا۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں یہ کسی سکھ زمیندار کی ملکیت تھا جس کو بعد میں حکومت اپنے تصرف میں لے آئی۔ مکان سے تھوڑے فاصلے پر احمد شاہ ابدالی کا مزار ہے۔ یہ وہی افغان حکمران تھا جس نے خانِ قلات میر نصیر خان کے قلعے کا محاصرہ کیا تھا۔ قلعہ تو فتح نہ ہو سکا، تنگ آ کر صلح کر لی۔

چارج لیتے ہی میں نے سب سے پہلی توجہ علمائے کرام پر دی۔ برادرم جو غلط فہمیاں پیدا کر گئے تھے ان کو دُور کرنا ضروری تھا۔ اتفاق سے ایس ایس پی مرزا محمد علی تھے۔ اس قدر شریف، محنتی اور مخلص پولیس افسر میں نے سروس میں نہیں دیکھا۔ وہ بھی ایکٹو ہو گئے۔ دیوبندیوں کا سب سے بڑا مدرسہ خیر المدارس ہے جس کے مہتمم قاری محمد حنیف جالندھری ہیں۔ والد کی وفات کے بعد انھوں نے اپنی ذمہ داریوں کو بطریقِ احسن نبھایا ہے۔ یہ اپنے نوجوان کندھوں پر بوڑھا سر رکھتے ہیں۔ نہایت خلیق، ملنسار اور زیرک انسان ہیں۔ انجمن سپاہ صحابہ پنجاب کے صدر مولانا سلطان محمود ضیا تھے۔ وہ بھی بڑے معاملہ فہم اور شریف انسان تھے۔ مولانا عطا اللہ شاہ بخاری کے صاحب زادگان عطا المحسن، عطا المنعم تھے تو خاصے راسخ العقیدہ مگر ان میں بھی رکھ رکھاؤ اور برتاؤ میں شائستگی تھی۔ جماعت اسلامی کے وزیر غازی، دیوبند مسلک کے خورشید عباس گردیزی اور شیعہ مسلک کے اشتیاق حسین جعفری، مولانا عنایت حسین، مظہر حسنی بھی دھیمے مزاج کے آدمی تھے۔ بڑی حیران کن بات ہے کہ پہلی ملاقات میں ہی تمام غلط فہمیاں اور گلے شکوے دور ہو گئے۔ میں کسی کام کے سلسلے میں لودھراں جا رہا تھا اپنے ساتھ قاری محمد حنیف جالندھری اور مولانا سلطان محمود ضیا کو لے گیا۔ راستے میں بڑی گپ شپ اور شعر و شاعری ہوتی رہی۔ وہ بھی شعر و شاعری کے رسیا نکلے۔ نتیجتاً سفر بھی آسانی سے کٹ گیا اور تمام کدورتیں بھی بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہو گئیں۔ قاری حنیف جالندھری سے دوستی اس قدر پکی ہو گئی کہ وہ ہر مرحلہ پر ممد اور معاون

ثابت ہوئے۔ ان سے آج تک دوستانہ تعلقات اور باہمی تکریم کا رشتہ ہے۔ اشتیاق حسین جعفری سے پرانی یاد اللہ تھی۔ یہ اے، میں حسن عباس نقوی کو ملنے لائلپور آئے تو ان سے تعارف ہوا۔ ان دنوں ملتان میں وکالت کرتے تھے اور بڑے کامیاب وکیل تھے۔ میں نے مولانا عطا اللہ شاہ بخاری کو تو نہیں سنا، کہتے ہیں برصغیر کے سب سے بہتر اور افضل خطیب تھے۔ خوش الحان تھے۔ مجمعے کو باندھ کر رکھ دیتے۔ ساری رات بولتے رہتے کوئی ہلنے کا نام تک نہ لیتا۔ ہٹلر کے متعلق بھی مشہور ہے کہ سامعین کو Spell Bound کر دیتا تھا لیکن ان میں ایک بنیادی فرق تھا۔ وہ سروں کا سوداگر تھا اور قبلہ شاہ صاحب دلوں پر راج کرتے تھے۔ باپ کا علم کچھ نہ کچھ تو بیٹوں کو بھی ورثے میں ملتا ہے۔ دونوں بھائی بھی اعلیٰ پائے کے مقرر تھے۔ لب ولہجہ منفرد اور آواز کا زیر و بم دل نشین تھا۔ بدقسمتی سے طبیعت میں ضد کا عنصر کچھ زیادہ تھا۔ مرزا محمد علی سے مشورے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ ہر ماہ ہر فکر کے علما کو کھانے پر بلایا جائے۔ پہلے میٹنگ ہوتی تاکہ گلے شکوے یا کوئی غلط فہمی ہو تو دور ہو جائے اور اس کے بعد کھانا۔ پہلی دفعہ عطا المحسن اور عطا المنعم نے یہ کہہ کر کھانا کھانے سے انکار کر دیا کہ وہ شیعہ مولویوں کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتے۔ بڑی مشکل سے قاری محمد حنیف جالندھری اور خورشید عباس گردیزی نے انہیں قائل کیا اور وہ بادلِ نخواستہ دسترخوان پر تو بیٹھے لیکن یوں گمان ہوتا تھا کہ کھانا کھا نہیں رہے زہر مار کر رہے ہیں۔ بعد میں ٹھیک ہو گئے اور کسی قسم کا اعتراض نہ کیا۔

وکلا سے تو ہمارا چولی دامن کا رشتہ ہے۔ کسی بھی ڈپٹی کمشنر کے لئے بار کو خطاب کرنا ضروری ہوتا ہے۔ میں نے خطاب کرنے سے پہلے ہی اُن کے مطالبات کی فہرست منگوا لی تھی۔ انہیں ڈسٹرکٹ بار کی عمارت تعمیر کرنے کے لئے رقم چاہیے تھی۔ میں نے پانچ لاکھ روپے کی گرانٹ کا اعلان کیا تو سب خوش ہو گئے۔ ملتان میں ڈپٹی کمشنرز ڈویلپمنٹ فنڈ میں خاصی رقم پڑی تھی۔ رحیم یار خان میں تو ہم نے حکومت کے ڈر سے فنڈ اکٹھا نہ کیا تھا۔ ملتان والوں نے ان ہدایات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ چراغ تلے اندھیرا ہوتا ہے۔

ملتان میں اس وقت اخباروں کی بھرمار نہ تھی۔ کافی عرصہ تک صرف نوائے وقت کی اجارہ داری رہی۔ بعد میں ضیا شاہد نے ''خبریں'' نکالنا شروع کر دیا۔ ''نوائے وقت'' کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر شیخ ریاض پرویز تھے۔ پیرانہ سالی کے باوجود ذہنی طور پر خاصے بیدار تھے۔ تمام صحافیانہ داؤ پیچ سے کماحقہ نہ صرف واقفیت رکھتے تھے بلکہ اکثر ان کا استعمال بھی کرتے رہتے۔ ان اختیارات نے ان میں

انانیت کُوٹ کُوٹ کر بھر دی تھی۔ گو ان کا فرزند اور داماد ملتان میں ہی تحصیلدار تھے پھر بھی شیخ صاحب نے کبھی دب کر بات نہ کی نہ کبھی کسی قسم کی ممنونیت کا اظہار کیا۔ میں نے چارج لیتے ہی دونوں دفاتر کا دورہ کیا اور ان کے مسائل جاننے کی رسمی سی کوشش کی۔ شیخ صاحب کچھ دن بعد ریٹرن کال کرنے گھر تشریف لائے۔ ہم نے ان کے لئے اچھا خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ جب وہ وقت پر نہ پہنچے تو مجھے حیرانی ہوئی۔ پتہ کرایا تو معلوم ہوا کہ باہر سے ہی ڈیوٹی گارڈ کے ساتھ لڑ جھگڑ کر چلے گئے ہیں۔ اس نے دروازہ کھولنے میں چند لمحوں کی تاخیر کر دی تھی۔ میں نے فون پر معذرت کی اور گارڈ کو تبدیل کرنے کی یقین دہائی کرائی تو تشریف لے آئے۔ بات کرتے ہوئے نگاہیں نیچی رکھتے اور گردن کو 45 ڈگری کے زاویے پر لے جاتے۔ ایسے پتہ چلتا جیسے وہ میزبان سے نہیں بلکہ دائیں بائیں بیٹھے کسی شخص سے مخاطب ہیں۔ اُن کی رعونت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ علیحدگی میں غلام حیدر وائیں وزیراعلیٰ کو بے تکلف سنا دیں۔ بتانے لگے کہ وائیں اُن کا پرانا یار تھا۔ جب وزیراعلیٰ بن کر آیا تو میں نے لبرٹی لیتے ہوئے اُسے اُلو کا پٹھا کہہ دیا۔ اس کے علاوہ بھی چند مغلظات سے نوازا تو اس نے غصے اور حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ ایک دفعہ تو میں ڈر گیا۔ کہنے لگا ''تم نے مجھے گالی دی ہے!'' مجھے اچانک احساس ہوا کہ بدلے ہوئے حالات میں لب ولہجہ بھی بدل جانا چاہیے۔ اگر میں منشی غلام حیدر وائیں کو ہزار مغلظات سناتا تو وہ محسوس نہ کرتا۔ یہ تو وزیراعلیٰ تھا لیکن آفرین ہے اس شخص پر اُس نے اس واقعہ کو کبھی دل سے نہ لگایا اور ہمیشہ میرا احترام کیا۔

بڑے میاں کے چھوٹوں نے بھی پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے۔ کھلے عام رشوت لیتے لیکن کسی کو اُن کی شکایت لگانے کی ہمت نہ ہوتی۔ اپنی مرضی سے دفتر آتے اور جب دل چاہتا چلے جاتے۔ خاص طور پر ان کے داماد کے متعلق بہت شکایتیں آنے لگیں تو میں نے اس کو بدل دیا۔ حسب توقع شیخ صاحب سفارش کے لئے آ گئے۔ میں نے اُنہیں سمجھایا کہ اس سے ان کی بڑی بدنامی ہو رہی ہے تو رو پڑے۔ کہنے لگے ''شاہ صاحب! میں آپ کو کیا بتاؤں۔ اس کم بخت نے میری راتوں کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ پاؤڈر کا نشہ یہ کرتا تھا۔ پیسے دونوں ہاتھوں سے نہیں بلکہ دانتوں سے بھی پکڑ لیتا ہے۔ جب میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں تو دھمکی دیتے ہوئے کہتا ہے کیا لڑکی کو طلاق دلوانی ہے؟ حرام کی ساری کمائی اللوں تللوں پر خرچ کر دیتا ہے۔ اس کا ڈیرہ میں چلاتا ہوں۔ اس معاشرے میں کسی لڑکی کا باپ ہونا بھی ایک عذاب سے کم نہیں۔''

مجھے پہلی دفعہ حیرانی ہوئی۔ بظاہر ایک پٹھے خان

اور جفاوری شخص بھی اندر سے کس قدر مظلوم ہو سکتا ہے۔ روزنامہ خبریں بھی بلیک میلنگ کے فن کو بلندیوں تک لے گیا تھا لیکن ملتان کی حد تک اس کے سٹاف کا رویہ نارمل اور مناسب تھا۔ ہمیں کبھی بھی ان سے شکایت نہ ہوئی۔ جنگ اخبار کے نمائندہ خان رضوانی صاحب شریف النفس اور ادبی ذوق کے مالک تھے۔ ان کی رپورٹنگ میں نمایاں متصدیت ہوتی۔ فرنٹیئر پوسٹ کے بیورو چیف عارف مظہر صاحب تھے جن کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ اس کے علاوہ بے شمار مقامی اخبارات تھے۔ اہل صحافت سے انتظامیہ کو بنا کر رکھنی پڑتی ہے۔ ہمیں تو ویسے ہی ان سے اُنس تھا اور ان کے جائز مسائل اور مطالبات کو پورا کرنے کی مقدور بھر کوشش کی۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ ملتان کو پنجاب کی سیاست میں ہمیشہ کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ملتان کے دو بڑے سیاسی خانوادے تو گیلانی اور قریشی تھے۔ سیاست کے علاوہ روحانیت پر بھی ان کی اجارہ داری تھی۔ گیلانی خاندان کے جد امجد موسیٰ پاک شہید کا ملتان میں مزار ہے۔ سالانہ عرس ہوتا ہے جہاں عقیدت مند آ کر اپنی مرادیں پاتے ہیں اور متولیوں کی جیبیں بھرتے ہیں۔ قریشی بھی بھلا کہاں پیچھے رہنے والے ہیں۔ قلعہ پران کے آباؤ اجداد کے مزاروں کی قطاریں ہیں۔ شاہ رُکن عالم حضرت بہاؤالدین ذکریا۔ قریشیوں کو اس اعتبار سے تھوڑی سی فوقیت حاصل ہے کہ ان کا حلقہ ارادت سندھ تک پھیلا ہوا ہے۔ مخدوم سجاد حسین قریشی سالانہ عرس پر جب سر پر سفید پگڑی رکھے اور سبز عبا پہنے اسٹیج پر آتے تو "سائیں موجھو، سائیں موجھو" کی صداؤں سے فضا گونج اٹھتی۔ یہ ایک دوسرے کے زبردست حریف رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے سے بھی بیزار لیکن کبھی اتفاق سے اکٹھے ہو جاتے تو ایک دوسرے کو اس انداز سے ملتے اور بغلگیر ہوتے کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے اعلیٰ اخلاقی روایات کہتے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو اس رکھ رکھاؤ کو سراسر منافقت سمجھتے۔

انہوں نے کبھی بھی ایک دوسرے کے خلاف الیکشن نہیں لڑا۔ اپنے اپنے حلقے میں کامیاب ہو جاتے۔ اس کے علاوہ گردیزی سید بھی ہیں لیکن سیاسی اعتبار سے وہ زیادہ تگڑے نہیں۔ خاکوانیوں کو بھی محدود پیمانے پر ان کا حصہ مل جاتا۔ غلام قاسم خاکوانی نہ صرف ملتان کے میئر رہے بلکہ ممبر اسمبلی بھی منتخب ہوئے۔

شہر کی سیاست البتہ عجیب تھی۔ وہاں ان دونوں کی دال نہ گلتی۔ ہر چند کہ یہ خود تو میدان میں نہ اُترتے البتہ اپنے گھوڑے دوڑاتے رہتے۔ تقسیم کے بعد شہر کا سیاسی نقشہ بدل گیا ہے۔ کثیر تعداد میں مہاجرین پاکستان آئے۔ اہل زبان تو کراچی میں بس گئے لیکن زبان سے کشتی لڑنے والے ملتان میں آباد ہو گئے۔ حصار کے رانگھڑ پیار سے بھی بات کریں تو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے

پتھر مار رہے ہیں۔ انتہائی جوشیلے، غصیلے اور منتقم مزاج۔ ویسے تو ان میں بھی تفرقہ تھا اور کئی گروپ بنے ہوئے تھے لیکن ان کا مسلمہ لیڈران دنوں شیخ رشید تھا۔ پیرانہ سالی کے باوصف اس کے اندر آگ کا پورا الاؤ دہک رہا تھا۔ شہر کی سیٹیں انہیں ہی ملتیں۔ ملک صلاح الدین ڈوگر میئر ملتان بھی شہر ہی سے منتخب ہوتا۔ اپنی برادری کے علاوہ وہ ان میں سے کسی نہ کسی گروپ کو اپنے ساتھ ملا لیتا۔ گیلانیوں کے ہیڈ آف فیملی مخدوم حامد رضا گیلانی تھے۔ وہ ایک طویل عرصہ تک اسمبلی کے ممبر منتخب ہوتے رہے۔ بڑے وجیہ انسان تھے۔ سرخ وسفید رنگ، چھ فٹ سے اُٹھتا ہوا قد، بڑے پڑھے لکھے اور نستعلیق انسان تھے۔ بات کرنے کا منفرد انداز تھا۔ لہجے میں دھیما پن، زبان میں مٹھاس اور باتوں میں وزن تھا۔ کسی زمانے میں ان کی بھٹو سے بڑی دوستی تھی۔ جب اس نے تحریک شروع کی تو پیپلز پارٹی میں شمولیت کی دعوت دی۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ عرفان وآگہی کے باوصف، سیاسی میدان میں ہمیشہ صحیح وقت پر غلط فیصلہ کرتے ہیں۔ انہوں نے معذرت کر لی۔ الیکشن ہار گئے۔ اس کے باوجود بھٹو نے تعلقات کو نبھایا اور انہیں کینیا میں سفیر بنا کر بھیج دیا۔ یہ واپس آئے تو دنیا بدلی ہوئی تھی۔ میدان سیاست میں انہیں حریف بھی ملا تو سگا بھتیجا۔ یوسف رضا گیلانی خاصے پرزے نکال چکا تھا۔ کہاں پرانی قدروں کا علمبردار ایک روایتی سیاست دان جو صبح اُٹھتا تو سورج نصف النہار پر ہوتا اور کہاں ایک شاطر نوجوان جو اس وقت تک ضلع کچہری پولیس اسٹیشنوں اور سرکاری دفاتر کے سات چکر کاٹ چکا ہوتا۔ ان کی ذہنی ساخت اور مطمع نظر کا ایک واقعہ سے پتہ چلتا ہے جو ان دنوں بڑا مشہور ہوا۔ کہتے ہیں کہ حامد رضا گیلانی کا ایک ووٹر اُن کے پاس آیا اور درخواست کی کہ وہ مقامی تھانیدار کو فون کر کے اس کا کام کروا دیں۔ مخدوم صاحب نے غصے بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ''تھانیدار میرے لیول کا آدمی نہیں ہے۔''

''تو پھر ایوب خان کو کہہ کر کروا دیں'' وہ معصومیت سے بولا۔

ان چند فقروں سے پتہ چلتا ہے کہ حالات کس قدر بدل گئے تھے جس کا حامد رضا کو ادراک نہ ہو سکا۔ وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کا سیاسی شعور بیدار ہوتا گیا۔ انہیں ایسے ممبروں کی تلاش تھی جو اُن کے کام کر سکیں، اُن کے ساتھ چل کر تھانہ کچہری جا سکیں۔ یہ مخدوم صاحب کے بس کا روگ نہ تھا۔

شاہ محمود قریشی اس کے برعکس یوسف رضا کی پالیسی پر گامزن تھا بلکہ کئی اعتبار سے اس سے بس دو ہاتھ آگے نکل گیا۔ پہلا الیکشن کیا ہارا، اس نے سیاست کا راز پا لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ

معروضی حالات کس بات کا تقاضا کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد وہ کوئی الیکشن نہ ہارا۔ یوسف رضا پہلے مسلم لیگ میں تھا، جونیجو کے گروپ میں شامل تھا۔ جونیجو پیر پگاڑا کا مرید تھا اور پیر صاحب یوسف رضا کے پھوپھا تھے۔ بعد میں جب جونیجو کو زوال آیا تو وہ پیپلز پارٹی میں داخل ہو گیا۔ ظاہر ہے شاہ محمود نے نواز شریف گروپ جائین کرنا تھا۔ یوسف مرکز میں وزیر بن گیا اور شاہ محمود نے صوبائی وزارت خزانہ سنبھال لی۔

جنرل حمید گل: جب میں ملتان پہنچا تو اس وقت جنرل حمید گل کور کمانڈر تھے۔ افغان جہاد کے حوالے سے ان کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا لیکن اس سے پہلے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ یہ ISI کے سربراہ بھی مقرر ہوئے۔ ان حوالوں سے ان سے ملنے کا شوق اور تجسس تو تھا ہی لیکن اس کے علاوہ بھی کور کمانڈر کو 'کال آن' کرنا پراٹوکول میں شامل تھا۔ بے شک سول حکومت ہی کیوں نہ ہو، فوج کا ہمیشہ ایک رول رہا ہے جو انتہائی اہم ہے۔ سول انتظامیہ کو محرم، میلاب اور الیکشن کے موقعہ پر فوج کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے سول اور فوجی افسروں کے کسی نہ کسی سطح پر رابطے ضروری ہیں۔ جن شہروں میں فوجی چھاؤنیاں ہیں وہاں یہ ضرورت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ کنٹونمنٹ کے علاقے میں فوج کا کنٹرول ہوتا ہے اور جب بھی VVIP Movement ہوتی ہے تو سول انتظامیہ کو ان کا تعاون درکار ہوتا ہے۔

لیفٹیننٹ جنرل حمید گل سے مل کر اندازہ ہوا کہ وہ کوئی عام جرنیل نہیں ہیں۔ زیرک، معاملہ فہم، کریٹس، آنکھوں میں بے پناہ ذہانت، ہر موضوع پر پوری اتھارٹی سے بولتے۔ کچھ یوں گمان ہوتا جیسے کہہ رہے ہیں مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔ مجھے اس قدر تو پہلے سے ہی معلوم تھا کہ IJI (اسلامی جمہوری اتحاد) ان کا Brain child ہے لیکن سیاست اور فوجی امور کے علاوہ ادب، ثقافت، صحافت اور دیگر موضوعات پر بھی ان کی مکمل گرفت تھی۔ انگریزی اور اُردو پر بھی انہیں یکساں عبور تھا۔ جرنیل انگریزی تو بہتر بول لیتے ہیں لیکن قومی زبان بولتے ہوئے وقت محسوس کرتے ہیں۔ فقرے جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تلفظ بھی نیم انگریزیانہ اور نیم دلانہ ہوتا ہے۔ اب وہ آتا ہے، جاتا ہے، کا زمانہ تو نہیں رہا لیکن قومی زبان بھی بوجوہ اپنا جائز مقام حاصل نہیں کر سکی۔ میں نے جھجکتے جھجکتے ہوئے جب خیال ظاہر کیا کہ ملتان میں عالمی اُردو کانفرنس ہونی چاہیے تو انہوں نے اس کی اہمیت اور افادیت پر ایک جامع لیکچر دے ڈالا۔ ان سے پہلی ملاقات خاصی خوشگوار رہی۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا ہی گیا اور مجھے ان کے خیالات اور شخصیت کو جانچنے پرکھنے کے نادر مواقع ملتے رہے۔

[جاری ہے۔]

غزل

بھَرم گنوا آئے
شہر سے بھر پائے
بھڑ کے بھڑ کیلے
بھوبل مِل آئے

چُورا چُورا ہیں
یار بھلے آئے
بھادوں بہتے ہیں
ساون کے سائے

تیل ، نمک ، لکڑی
پَل پَل یاد آئے
بھاگ بھری برکھا
بھاری کہلائے

آنسو پی پی کر
پیاس تو بجھ جائے
بچّوں سی باتیں
دل بھَر بھَر آئے

لاکھ بھبھوت ملو
بھُوک نہ مر پائے
آنکھ سے تن مَن میں
بھاجڑ مچ جائے

بیراگی مَن میں
جھاڑو پھر جائے
بھیڑے بھیس پھریں
پانی جھلسائے

جس سے بات کریں
پھوڑے سہلائے
دین دھرم والے
بھک منگے آئے

خالد احمد

گھر سے نکلے ہیں
مہکے مہکائے

در در پہنچیں گے
جھولی پھیلائے

بھس کے مول بکے
بھیس نہ بھر پائے

کوئی کبھی ہم سے
بات ہی کر جائے

آنکھوں آنکھوں میں
بہکے بہکائے

تن کا کپڑا بھی
بھٹی چڑھ جائے

نام دھرے خالد
نام کوئی پائے

غزل

جلیل عالی

توبہ پہ بھی جو پاس بٹھائے نہیں گئے
اگلے گناہ کے ابھی سائے نہیں گئے

جگ گھوم گھام پھر اسی چھت کے تلے ملے
گھر بیچ باچ دیس پرائے نہیں گئے

جُھٹلا سکا نہ کوئی ہمارا کہا مگر
سمجھے کبھی بھی صاحبِ رائے نہیں گئے

ہارا جفا کے سامنے کیا کیا زرِ انا
انکار ایک دو بھی کمائے نہیں گئے

بارِ معاملات کے ڈھونے کا دم کہاں
گل حسنِ گفتگو کے اٹھائے نہیں گئے

اک لَو لہو میں شوقِ شہادت کی تھی سو ہم
مقتل میں آپ آئے ہیں، لائے نہیں گئے

عالی گھرے ہیں سوچ عذابوں میں ذہن و دل
مدت ہوئی ہے خواب سرائے نہیں گئے

غزل

اُف کرے دل اگر زبان سمیت
عرش ہِل جائے آسمان سمیت

کوئی رہزن ہو آپ جیسا تو
پیشِ خدمت ہے مال، جان سمیت

جب ہوئی اختصار کی درخواست
ہم چلے آئے داستان سمیت

مکتبِ زندگی میں آتی ہے
ایک ایک آن امتحان سمیت

قبر باقی نہ یاد ہی باقی
نام تک مٹ گیا نشان سمیت

دل سے جاتا نہیں وطن کا خیال
گو ہم آئے ہیں خاندان سمیت

میز بھی ہے یہیں مسہری بھی
میرا دفتر ہے یہ مکان سمیت

جرمِ الفت عیاں تھا چہرے سے
جج نے لوٹا دیا بیان سمیت

ان کی چوکھٹ پہ ہو گئے ہم ڈھیر
سر بلندی سمیت ، آن سمیت

جھک گئی تھی کمر دُکھوں سے شعور
ہم معمر بھی تھے جوان سمیت

انور شعور

غزل

گلوں کی خندہ لبی سے ملی ہے آسائش
عروج پر ہے بہارِ چمن کی آرائش

سہانی یاد سے دل میں مہک سی اٹھتی ہے
نفس نفس میں بہاراں ہوئی ہے زیبائش

طلب کریں بھی کوئی مشورہ تو خود سے کریں
جہاں میں ایک یہی معتبر ہے فہمائش

یہ سوئے ظن، یہ بد اندیش وسوسے توبہ
خدا کرے، رہے، یہ دور ہم سے آلائش

رکیں تو وسعتِ صحرا بھی بڑھتی جاتی ہے
بڑھیں تو خاک ہماری نظر میں آسائش

ہزار موسموں کے پیچ وخم سے گزری ہے
فروغِ دیدۂ ودل پھر بنی ہے افزائش

دل ونظر کی حمیت پہ شاق گزری ہے
لبوں پہ پھول کے آئی ہے جب بھی فرمائش

خیالِ یار نے آسودگی عطا کی ہے
ٹھٹھرتی صبح کو جیسے ملی ہو گرمائش

سدا ریاض رہے بے نیاز حبِ طلب
ضعیف کرتی ہے سود وزیاں کی پیمائش

سید ریاض حسین زیدی

غزل

یُوں مِرے بُرجِ مُلاقات میں داخل ہو جاؤ
شعر بن کر مِرے وِجدان پہ نازل ہو جاؤ

بہتے پانی سے کوئی ربط تو رکھنا ہو گا!
گر سمندر نہیں ہو سکتے ہو، ساحل ہو جاؤ

اِک نئی زیست کا آغاز بھی ہو سکتا ہے
اتّفاقاً جو کبھی تُم مُجھے حاصل ہو جاؤ

فیصلہ کوئی مِرے بارے میں کرنا ہے تمہیں
"تُم مسیحا نہیں ہوتے ہو تو قاتل ہو جاؤ"

ٹمٹماتے ہوئے تاروں کی طرح کیا جینا!
اُفقِ شب پہ مثالِ مہِ کامِل ہو جاؤ

لے کے آیا ہے عدُو پھر جو کوئی دامِ فریب
تم کہیں اُس کی دلیلوں سے نہ قائل ہو جاؤ !

سرحدِ جاں سے اُدھر کا سفر آساں تو نہیں
اپنے رستے میں تم ایسے تو نہ حائل ہو جاؤ

کبھی پسپائی کی نوبت ہی نہ آنے پائے
جنگ میں آپ ہی تُم اپنے مقابل ہو جاؤ

شہر سے ہو کے مخاطب کوئی کہتا ہے اُسے
کُوئے جاناں کی جگہ کوچۂ قاتل ہو جاؤ

فتح مندی میں تو اِک رنگِ ہزیمت آیا
جا کے ہارے ہوئے لشکر میں ہی شامل ہو جاؤ

ابدی نیند سے بہتر تو یہی ہے کہ نسیم
پھر سے اِس کارگہِ درد میں داخل ہو جاؤ

نسیمِ سحر

غزل

مری سوچوں میں کیسی بے کلی ہے
مرے خوابوں پہ چھائی بے دلی ہے

طلسماتی فضا میں میری حسرت
بنا جھولے کے جھولا جھولتی ہے

اِدھر دھرتی کا ہے بے رنگ سبزہ
حسیں پھولوں کی رنگت بھی اُڑی ہے

سجیلی مچھلیاں بھی دربدر ہیں
ادا لہروں کی یکسر اجنبی ہے

لہو کا رقص ہے رگ رگ میں جاری
خدا جانے یہ کیسی ساحری ہے

ہلاہل تیرتا ہے پانیوں پر
قضا اُوڑھے ہوئے گویا ندی ہے

لرزتے ہیں سبھی کوہ و دمن بھی
گھڑی جو آئے گی وہ منتہی ہے

سبھی منظر نڈھال و مضطرب ہیں
پسِ منظر قیامت جھانکتی ہے

کسی کو آفریں لے بھائے کیسے
لبوں پر جب انوکھی بانسری ہے

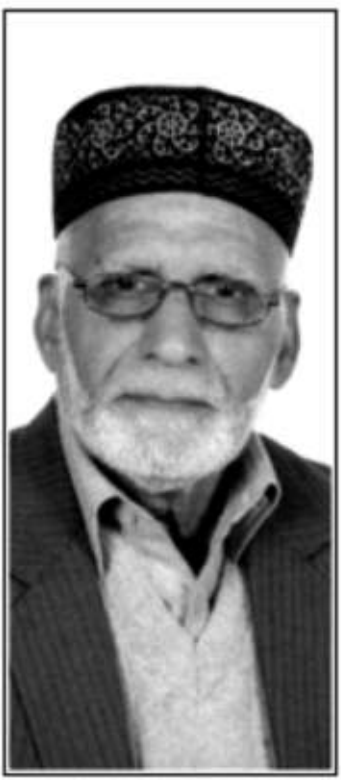

رشید آفرین

غزل

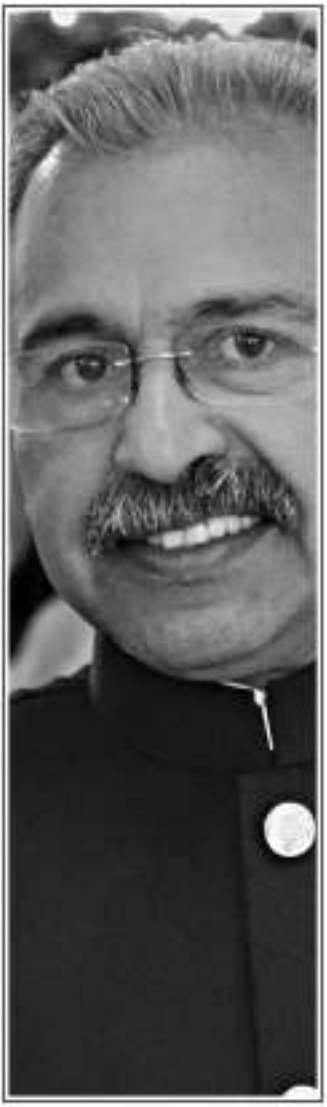

دل بھی چاہے تو نظر کیسے لڑے
ہو گئے ہیں آپ کے بچے بڑے

چوم کر آنکھوں سے وہ دل نے چنے
پھول ان ہونٹوں سے جتنے بھی جھڑے

اور کتنی عمر روندے جائیں گے
ہم گیاہِ راہ کی صورت پڑے

سچ کے سیلِ تند کے آگے کبھی
جھوٹ کے پُل رہ نہیں سکتے کھڑے

بات بھی محسوس ہوتی ہے کبھی
جیسے سینے میں کوئی نیزہ گڑے

اس نے بھی دیکھا بہت ہے سرد گرم
امتحاں ہم نے بھی کاٹے ہیں کڑے

تیرگی کے روبرو بن کر چراغ
تا کجا راحت رہو گے تم اڑے

راحت سرحدی

غزلیں

اِس لیے ہی تو اندھیرے میں دھرے رہتے ہیں
شمع رُویوں کے ٹھکانوں سے پرے رہتے ہیں

چھوڑ دیتے نہیں جو شاخِ شجر کا دامن
زرد موسم میں بھی وہ پات ہرے رہتے ہیں

سینہ و دل کہاں فارغ رہے عشاقوں کے
یہ خزانے تو عجب غم سے بھرے رہتے ہیں

شہر میں جس کی محبت کا ہے چرچا یارو
کیا ستم ہے کہ ہم اُس سے ہی ڈرے رہتے ہیں

شکوۂ جور و ستم کرتے ہیں، لیکن حد ہے
پھر اُسی شوخ کی خدمت میں مَرے رہتے ہیں

خاور اعجاز

محفلِ دوست میں ہم آن کے چُپ بیٹھے ہیں
اور وہ ہیں کہ سبھی جان کے چُپ بیٹھے ہیں

ایک ہنگامہ بپا ہے سبھی اطراف مگر
اہلِ دربار بُرا مان کے چُپ بیٹھے ہیں

کھول رکھا ہے ترے خواب نگر کا نقشہ
اور اِک سبز ردا تان کے چُپ بیٹھے ہیں

جانے کیا دستِ قضا نے اُنھیں پیغام دیا
جو کہ طالب تھے مری جان کے چُپ بیٹھے ہیں

گونجتی پھرتی ہے آوازِ جرس کس کے لیے
ہم تو یاں پاس ہی سامان کے چُپ بیٹھے ہیں

غزل

آنکھ پھر تیرے خواب سے بھر لوں
یہ پیالہ سراب سے بھر لوں

پھر شب ہجر آنے والی ہے
روشنی آفتاب سے بھر لوں

کس لئے طالبِ ثواب بنوں
سر حساب و کتاب سے بھر لوں

کامیابی کی راہ پر نکلوں
زندگی اضطراب سے بھر لوں

کیسے تجدید کار عشق کروں
روز و شب پھر عذاب سے بھر لوں

کیسے مانوں رحیم کو جابر
جام کو اجتناب سے بھر لوں

ہاتھ پھیلاؤں گا دعا کے لئے
پہلے چلّو شراب سے بھر لوں

شاہنواز زیدی

غزل

جو ملا تھا کم و بسیار اٹھا لایا تھا
شہرِ گل سے میں خس و خار اٹھا لایا تھا

ایک ہی سنگ کہاں سر کی کفایت کرتا
سو میں دیوار کی دیوار اٹھا لایا تھا

اور وہاں کیا تھا بجز بارِ ہزیمت جس کو
میرا ہارا ہوا سالار اٹھا لایا تھا

میں چمن زارِ محبت کا وہ زائر ہوں کہ جو
پھول نایاب تھے تو خار اٹھا لایا تھا

مسندِ عدل پہ بیٹھا ہے وہی شخص کہ جو
رائی کے بدلے میں کوہسار اٹھا لایا تھا

خوش نصیبی نے مجھے پار لگایا ورنہ
میں تو ٹوٹی ہوئی پتوار اٹھا لایا تھا

طالب انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اس چھت سے کبھی دُھوپ اُترتی نہیں خالد
عزت تو یہ دیتے ہیں گھرانے نہیں دیتے

غزل

اقرار بھی ہے پہلے سی وحشت نہیں رہی
دل پارسا رہے گا ، ضمانت نہیں رہی

یہ شہر اِک فریب میں پھر مبتلا ہوا
کچھ خواب اور کوئی بشارت نہیں رہی

کیا کیا فریب کھائے ہیں ہم جیسے سادہ دِل
پہلے کے جیسی خود سے قرابت نہیں رہی

بے نام سا اُجاڑ ہے اور نامرادیاں
رنج ایسے ایسے آنکھ میں حیرت نہیں رہی

اے رنجِ رایگاں نیا اِک دشت ڈھونڈ لے
''دل میں غبار ہونے کی طاقت نہیں رہی''

سورج تو جل رہا ہے اُسی آن بان سے
پہلے کے جیسی پر وہ تمازت نہیں رہی

ملتے ہیں روز اب بھی ملاتے ہیں ہاتھ بھی
بس حاضری ہے اَب وہ عبادت نہیں رہی

اُمید کا کیا کیجیے وہ مر نہیں رہی
اور سوچنے کو عظمیؔ بشارت نہیں رہی

اسلام عظمی

غزلیں

جب برسے گا بادل، تھوڑی دیر کے بعد
بہہ جائے گا کاجل، تھوڑی دیر کے بعد

یادوں نے پھر چھیڑ دیا ہے راگ مَلھار
رقص کرے گا پاگل، تھوڑی دیر کے بعد

مہکیں گے رُخسار و لب و عارض کے گلاب
جب اُٹھے گا آنچل تھوڑی دیر کے بعد

لمبی نیند نے آخر پیاس بجھا ڈالی
کوئی لایا چھاگل، تھوڑی دیر کے بعد

ڈوب نہ جائے رات کا سورج، جانِ انیس
چلا نہ جائے سانول، تھوڑی دیر کے بعد

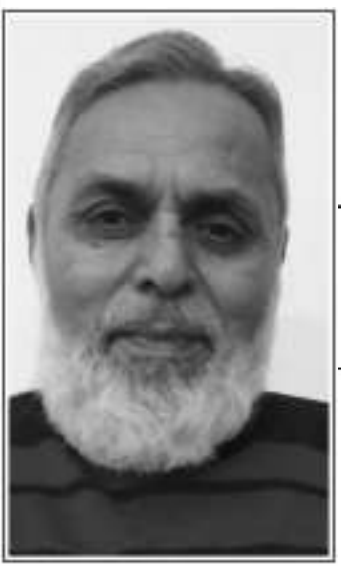

محمد انیس انصاری

اپیل کا بھی حق نہیں دیا گیا
وہ کیسا فیصلہ مجھے سُنا گیا

یہ کون تھا، جو خواب میری آنکھ کا
کسی پرائی آنکھ میں سجا گیا

ہتھیلیوں سے ڈھلتی عُمر کا وبال
سُہاگ کی لکیر ہی مِٹا گیا

وہ جس گلی میں روز و شب گزر گئے
وہ کیا گیا، وہ گھر، وہ راستہ گیا

انیسِ جاں! یہ پہلا واقعہ ہُوا
مجھے مِلے بغیر وہ چلا گیا

غزل

یہ حرف و لفظ کی کشتی، یہ آب کاغذ پر
بناتا رہتا ہوں اب تو سراب کاغذ پر

مہک اُٹھی تری خوشبو سے رات تنہائی
جو تیرے نام کا لکھا گلاب، کاغذ پر

عجیب طرح کی تعبیر دوست کھینچتے ہیں
کبھی جو بنتا ہوں دو چار خواب کاغذ پر

دکاں لگاتا ہوں زخموں کی جب بھی رات گئے
اُترنے لگتے ہیں پھر ماہتاب کاغذ پر

ترے جمال کی تصویر بن نہیں پاتی
لکھے پڑے ہیں کئی انتساب کاغذ پر

اُدھار تیری کہانی کا بھی چُکا لوں گا
میں نقدِ جاں کا تو کر لوں حساب کاغذ پر

کہاں سے لاؤں گواہ و وکیل و محضر، میں
کہ بات دل کی ہوئی کب جناب کاغذ پر

ناصر علی سید

غزل

لفظوں میں تصویر بناتے رہتے تھے
دل میں سینکڑوں باتیں سوچ کے رکھتے تھے

اُجلے منظر ہم فلماتے رہتے تھے
وقت پڑے تو پھر شرماتے رہتے تھے

گاؤں کی صبحیں ہنستی گاتی رہتی تھیں
رشتہ ملتے جوتے بھی گھس جاتے تھے

آس کے پنچھی آتے جاتے رہتے تھے
برسوں یونہی آتے جاتے رہتے تھے

ڈانٹ بڑوں سے پڑ جاتی تھی لیکن ہم
چھوٹے کام بڑے انداز میں کرتے تھے

گلیاروں میں دھوم مچاتے رہتے تھے
گویا آنگن کو صحراتے رہتے تھے

نار کنویں پر پانی بھرنے آتی تھی
دنیاؤں کے اندر کچھ دنیائیں تھیں

دیکھنے والے دل بہلاتے رہتے تھے
اک اک نقطہ ہم پھیلاتے رہتے تھے

سکھیاں مل کر واریں گاتی رہتی تھیں
حاصل ہم کو کیا ہونا تھا آخر کار

لڑکے بالے ہیر سناتے رہتے تھے
خیال خلا میں تیر چلاتے رہتے تھے

ایک طرف تو فصلیں کٹتی جاتی تھیں
گرہیں اور مسلسل پڑتی جاتی تھیں

کچھ مستانے ڈھول بجاتے رہتے تھے
وقت کا ریشم ہم سلجھاتے رہتے تھے

آنکھوں میں کچھ اور کہانی ہوتی تھی
لیکن ہم بھی دھوکا کھاتے رہتے تھے

جانے اُن کرداروں کو کیا ملتا تھا
چھپ چھپ کے جو خط پہنچاتے رہتے تھے

کوئی آئے یا نہ آئے رستے میں
ہم تو پلکیں روز بچھاتے رہتے تھے

دل کے سونے آنگن میں کچھ یادوں کے
شام سے ہم دیے جلاتے رہتے تھے

نذر عابد

غزلیں

بغیرِ حرف میں تحریر خلق کرتا ہوں
فقط نگاہ سے تصویر خلق کرتا ہوں

میں پیش کرتا ہوں خود اپنے دست و بازو کو
اگر کبھی کوئی زنجیر خلق کرتا ہوں

نہ جانے پھر یہی آنکھیں مری رہیں نہ رہیں
میں پہلے خواب سے تعبیر خلق کرتا ہوں

کئی ہدف اسے اپنی طرف بلاتے ہیں
ہدف بھلا کے جو میں تیر خلق کرتا ہوں

لہولہان جو دیکھوں میں زیردستوں کو
تو پھر کبھی کبھی شمشیر خلق کرتا ہوں

ہمیشہ عشق میں عجلت سے میں نے کام لیا
وہ جلد باز ہوں تاخیر خلق کرتا ہوں

صفدر صدیق رضی

بہت نہیں مگر اتنا شعور ہے مجھ میں
مری انا نہیں اسکا غرور ہے مجھ میں

جو اس نے اتنی محبت سے مجھکو دیکھا ہے
کوئی نہ کوئی خرابی ضرور ہے مجھ میں

میں خود کو ڈھونڈ سکا ہوں نہ پا سکا اس کو
مگر کہیں کوئی نزدیک و دور ہے مجھ میں

تو ماہتاب ہے کچھ دیر بام پر تو ٹھہر
تری طرح ہنرِ کسبِ نور ہے مجھ میں

یہ تو نہیں ہے تو پھر ہے ترا مقام کہاں
یہ میں نہیں ہوں تو کس کا ظہور ہے مجھ میں

کھلی کتاب کی مانند ہوں رضی لیکن
وہ پڑھ نہ پائے جو بین السطور ہے مجھ میں

غزل

گرا ہے جو پرندہ آشیاں سے
اسے لڑنا ہے اب سارے جہاں سے

ضرور اک فائدہ ہوتا ہے آخر
زیاں اتنا نہیں ہوتا زیاں سے

جو ہر لمحے نیا لمحہ تراشے
وہی واقف ہے رازِ کن فکاں سے

اگر شامل نہیں فکر و تدبر
تو پھر بے زار ہوں سحرِ بیاں سے

جو چلاتا ہے اس کا ڈر نہیں ہے
بہت ڈرتا ہوں لیکن بے زباں سے

وہی اک بات تھی محفوظ ثاقب
جو بچ کر رہ گئی تھی رازداں سے

منظور ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پریشاں رو ، کسی پہلو نہیں تھا
ترا غم موجۂ خوشبو نہیں تھا

غزلیں

سر بسر خوشبو سے مہکا ہونا
یعنی خوشبو کا سراپا ہونا
پھول کا کھلنا سرِ شاخ دعا
یعنی امید کا پیدا ہونا
سب ہی اچھے کو برا جانتے ہیں
اتنا اچھا نہیں اچھا ہونا
میں نے دیکھا ہے کہیں گرما میں
پھول کا خوشبو سے دہکا ہونا
ہم بھی آئے تھے تری محفل میں
ہم کو بھایا نہ تماشہ ہونا

سعد اللہ شاہ

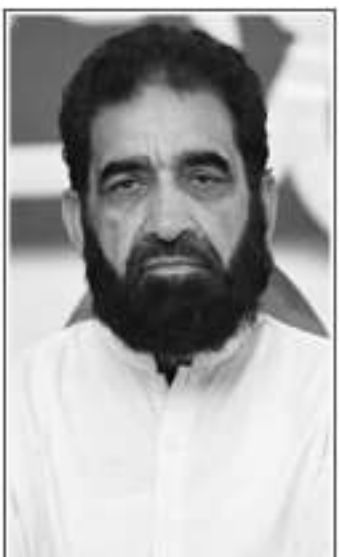

کون سمجھے مرا تنہا ہونا
یہ ہے دنیا سے شناسا ہونا
کاش خوشبو کی طرح ہو جائے
میرا دنیا میں ذرا سا ہونا
اس طبیعت میں تنوع تو یہ
کبھی تولہ کبھی ماشہ ہونا
ایک پگڑی کا الٹ جانا بھی
سربسر سر کا ہے کاسہ ہونا
اس کو صحرا میں بدل سکتا ہے
ہمہ تن پیاسے کا پیاسہ ہونا

آگہی علم کی کیا پوچھتے ہو
اک سمندر کا کنارا ہونا
کتنا مضبوط بنا دیتا ہے
بے سہارا کا سہارا ہونا
ہر گھڑی رہتا ہے بس پیش خیال
سعد اک حشر کا برپا ہونا

میری آنکھوں میں بھی آنسو
میرے دل کا یہ بتاسہ ہونا
ایک حکمت سے عنایت اس کی
یعنی وعدے کا دلاسہ ہونا
حوصلہ کس میں کہ دیکھے کوئی
سعد اک درد کا ہالہ ہونا

غزل

لہو میں اضطراب آئے نہ آئے
یہ شب یہ ماہتاب آئے نہ آئے

منالے جشنِ نیرنگ تمنا
پھر ان آنکھوں میں خواب آئے نہ آئے

یہ بستی کور چشموں کی ہے بستی
انہیں کیا آفتاب آئے نہ آئے

ابھی بے پردہ مت کر حسن اپنا
مری آنکھوں کو تاب آئے نہ آئے

نکل آ گھر سے باہر پھر یہ بارش
دوبارہ بے حساب آئے نہ آئے

غمِ ہجراں سے آنکھیں بجھ گئی ہیں
وہ چہرہ بے نقاب آئے نہ آئے

ہوائے زر نے دھندلا دی مری روح
اس آئینے پہ آب آئے نہ آئے

شجر تو چھاؤں پھیلاتا رہے گا
کوئی خانہ خراب آئے نہ آئے

نیا انسان خود قہر زمیں ہے
فلک سے اب عذاب آئے نہ آئے

تغیر زندگی کے ہمقدم ہے
صدائے انقلاب آئے نہ آئے

پرانی صحبتوں کا دور واپس
سرِ شہرِ خراب آئے نہ آئے

فراتِ خوں قدم چھونے لگی ہے
سو اب خیموں میں آب آئے نہ آئے

کسے معلوم کل شاخ شجر پر
کوئی تازہ گلاب آئے نہ آئے

کہے جاؤں میں حرفِ دل فراست
ان آنکھوں کا جواب آئے نہ آئے

فراست رضوی

غزل

جس طرح شاخ پہ آکر کوئی طائر ٹھہرا
میں ترے شہر میں اک دن کا مسافر ٹھہرا

دل ترے نام پہ کس دن نہیں دھڑکا میرا
کونسا پل میں ترے یاد سے قاصر ٹھہرا

تو کہ مشہور ہے ہر ناز و ادا میں اپنے
ایک میں ہوں کہ جو بے نام سا شاعر ٹھہرا

میں نے ہر چیز کو دیکھا ہے تری نسبت سے
میں جہاں بھی کہیں ٹھہرا تری خاطر ٹھہرا

میں نے صرف ایک جھلک ہی تو تری دیکھی تھی
کوئی بھی عکس ان آنکھوں میں نہیں پھر ٹھہرا

یہ الگ بات شجر سوکھ گیا پت جھڑ میں
وہ ہری ہی رہی ،جس شاخ پہ طائر ٹھہرا

تو نہیں دل میں اگر ،تو تری حسرت ہی سہی
اس خرابے میں چلو کوئی تو آخر ٹھہرا

میری سوچوں کی چبھن مار گئی ہے مجھ کو
یہ زمانہ بھی مرا دوست بظاہر ٹھہرا

حسن کو جنس سمجھ کے یہاں پرکھا سب نے
ہر کوئی مصر کے بازار کا تاجر ٹھہرا

محمد اشرف کمال

غزل

ایک علاقہ اُدھر پرانا پڑتا ہے
روزانہ اس راہ پہ جانا پڑتا ہے

ہمدردی کی رمق نگاہ میں تھی لیکن
آگے اپنا ہاتھ بڑھانا پڑتا ہے

دنیا کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے
کسی نے کہا کہ واپس جانا پڑتا ہے

ساتھ کی کرسی پر بیٹھے اے پیارے شخص
تیرے میرے بیچ زمانہ پڑتا ہے

جان میں جاں پڑتی ہے میری اُس لمحے
چڑیا کے جب مونہہ میں دانہ پڑتا ہے

اسے تلاش کرو اس جیسے حاسد کو
راہ میں پتھر ہو تو ہٹانا پڑتا ہے

آپ کہاں دیکھیں گے محفل کے دوران
میز سے ایک گلاس گرانا پڑتا ہے

سخنوروں کی مجبوری ہے رخشندہ
ان کو اک محبوب دکھانا پڑتا ہے

رخشندہ نوید

غزل

بجھا جو دل تو ہر سُو تیرگی ہی تیرگی ہو گی
جلاؤ گے دیے بھی تو نہ گھر میں روشنی ہو گی

غمِ دنیا ، غمِ عقبیٰ غمِ ہستی ، غمِ جاناں
بھلا اتنے غموں میں زندگی کیا زندگی ہو گی

نہیں تھا ظرف یہ میرا کہ میں ہنس کر ستم سہہ لوں
تمھاری دشمنی میں کچھ نہ کچھ تو دوستی ہو گی

جو بس اک قطرۂ شبنم کو بھی دریا سمجھتے ہیں
یقیناً اُن کے لب پر عمر بھر کی تشنگی ہو گی

اگر محلوں کے سائے میں رہے ہر عہد کی شیریں
کسی پرویز سے فرہاد کی کیا دوستی ہو گی

کسی کو میں نے پہچانا ہے اپنے آپ میں محسن
مری خود آگہی میں گم نہ میری عاشقی ہو گی

میتھیو محسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم تجھ سے لڑیں گے تری موجوں کے سہارے
اے بحر! ترے ساتھ ترے پار چلیں گے

غزلیں

کوئی اچھا دکھائی دیتا ہے
عشق ہوتا دکھائی دیتا ہے

فصلِ گُل میں سب ایسے ویسوں کو
ایسا ویسا دکھائی دیتا ہے

کاش! تم بھی اُسی طرح دیکھو
ہم کو جیسا دکھائی دیتا ہے

دل کی حالت کا تذکرہ کیسا
دل شکستہ دکھائی دیتا ہے

سچ تو یہ ہے کہ یہ جہاں سارا
ایک دھوکا دکھائی دیتا ہے

ہار بیٹھا ہے عشق کی بازی
وہ جو اجڑا دکھائی دیتا ہے

سوئے شوکت نظر ہوئی ، تو کہا
یہ تو اپنا دکھائی دیتا ہے

شوکت محمود شوکت

دیکھتے ہو کیا چشمِ حیرت سے
میں ہوں زندہ ، خدا کی رحمت سے

اک دیا بھی بجھا سکی نہ ہوا
چل رہی تھی بڑی رعونت سے

سوئے صحرا قدم نہیں اٹھتے
دل بھی اکتا گیا محبت سے

میری بستی میں ، شام کا منظر
کم نہیں ہے کسی قیامت سے

ان فقیروں سے بھی کبھی تو مل
مل کے دیکھا ہے اہلِ دولت سے

آب زر کو جو آب زر جانیں
باز آتے ہیں کب نصیحت سے؟

پوچھنے کا ، بھلا تکلف کیوں
تو ، تو واقف ہے حالِ شوکت سے

غزل

نگر نگر میں محبت کے گُل سجا کے چلو
جو سنگ راہ میں آئے اسے ہٹا کے چلو

یہی ہے مقصد تخلیق باخدا لوگو
دیار جبر میں تم آئینہ اُٹھا کے چلو

کھلاؤ پھول دعاؤں کے ہر بشر کے لیے
سبھی کے رنج کو اپنا کے مسکرا کے چلو

جو چاہتے ہو کہ نصرت تمھارے نام رہے
تو پھر ضروری ہے سب کشتیاں جلا کے چلو

وہ راستے جو سدا تیرگی کے قیدی ہیں
لہو کے دیپ انھی پر جلا جلا کے چلو

جو چاہتے ہو کہ تاریخ تم پہ فخر کرے
پھر آئینے کو ذرا آئینہ دکھا کے چلو

تمھارے سینے میں شاہد ہیں زندہ جذبے اگر
تو پھر ضمیر یہ سوئے ہوئے جگا کے چلو

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

رعنائیِ خیال سے آگے کی چیز ہے
شعر و سخن کمال سے آگے کی چیز ہے

اے دوست تیرے عارض و رخسار کا یہ رنگ
یہ لال رنگ ، لال سے آگے کی چیز ہے

یہ زخم تیرے تیر یا تلوار کا نہیں
یہ زخم اندمال سے آگے کی چیز ہے

اک دن کسی صیّاد سے یہ صید نے کہا
زلفوں کا جال ، جال سے آگے کی چیز ہے

میں حسنِ لازوال بھی کیسے کہوں تجھے
تُو حسنِ لازوال سے آگے کی چیز ہے

دل کی دھمال اور ہی شے ہے مرے عزیز
دھڑکن کی تال ، تال سے آگے کی چیز ہے

لہجہ کچھ اور چیز ہے لفظوں سے ماورا
شاہد یہ بول چال سے آگے کی چیز ہے

افتخار شاہد

غزل

میں بچوں کو اُجالے دے رہا ہوں
کتابوں کے کھلونے دے رہا ہوں

بڑھاتا جا رہا ہوں ان کی قیمت
جن آئینوں کو چہرے دے رہا ہوں

جہاں ویرانیوں کا ہے بسیرا
انہی آنکھوں کو سبزے دے رہا ہوں

مرے مرنے کی جن کو ہے تمنا
انہیں سانسوں کے تحفے دے رہا ہوں

ہر اک تتلی ہے رقصیدہ چمن میں
اسے خوشبو کے جھمکے دے رہا ہوں

یقیناً ان سے نفرت ہی ملے گی
جنھیں الفت کے قرضے دے رہا ہوں

پریشاں ہیں جو راتوں کے مسافر
عقیل ان کو سویرے دے رہا ہوں

عقیل رحمانی

غزل

ابھی تک مارے مارے پھر رہے ہیں
یہ کیسے دن ہمارے پھر رہے ہیں

کسی سے جیت کر اتنے فسردہ
کہ جیسے جنگ ہارے پھر رہے ہیں

لگا رکھا ہے دنیا بھر کو آگے
مگر پیچھے تمہارے پھر رہے ہیں

انہی پیڑوں کے نیچے بیٹھتے تھے
یہیں پر لے کے آرے پھر رہے ہیں

وہیں پھر پھر پھرا کر آ گیا ہوں
وہی سارے کے سارے پھر رہے ہیں

منافع خور اتنا ہو چکا ہوں
تعاقب میں خسارے پھر رہے ہیں

کہانی عمر پوری کر چکی ہے
مگر کردار سارے پھر رہے ہیں

وہ ٹھاٹھیں مارتا دریا کہاں ہے
کنارے ہی کنارے پھر رہے ہیں

فلک کا رنگ نیلا پڑ گیا ہے
زمیں پر چاند تارے پھر رہے ہیں

میاں دلی یہ وہ دلی نہیں ہے
کہاں غالب بچارے پھر رہے ہیں

وہ ، تشبیہوں کا جادو گفتگو میں
لبوں پر استعارے پھر رہے ہیں

مسعود احمد

غزل

دشتِ ویران تو اب اتنا بھی ویران نہ ہو
مجھکو لگتا ہے کہیں گھر کا بیابان نہ ہو

خود سے پہلی ہے ملاقات مری جانتا ہوں
پھر بھی اے آئنے تو اتنا تو حیران نہ ہو

اس میں جذبے تو دھڑکتے نہیں دیکھے میں نے
غور سے دیکھ کہیں دل ترا بے جان نہ ہو

خواب ایسے نہ سجانا میری ان آنکھوں میں
جن کی تعبیر کا کوسوں تلک امکان نہ ہو

ایسے گھر کی نہیں اب مجھ کو ضرورت کوئی
زندگی کرنے کا جس میں کوئی سامان نہ ہو

درد ایسا ہی کوئی مجھ کو عطا کر جاناں
جس کا بن تیرے یہاں کوئی بھی درمان نہ ہو

جانے کیوں پھر بھی تکے جاتے ہو رستا اسکا
جس نے وعدہ نہ کیا ہو کوئی پیمان نہ ہو

وہ یقیناً ہے کوئی بارگہِ عشق جلیل
جس کے دروازے کھلے ہوں کوئی دربان نہ ہو

میں مسلمان ہوں پھر بھی مجھے دھڑکا ہے جلیل
بتِ کافر وہ کہیں میرا بھی ایمان نہ ہو

احمد جلیل

غزل [نذر خالد احمد]

بدن تو ایک حوالے کا ہے نشان میاں
فصیلِ جسم سے آگے کئی جہان میاں

خود آشنائی کی خواہش ہے نقطۂ آغاز
بہت قدیم نہیں اپنی داستان میاں

فضا بدلنے پہ قدرت بھی ہاتھ آئے گی
ہوئے جو دوست چراغ اور سائبان میاں

کسی مدار کی رنگینیوں میں شامل ہے
کشش کی دھار پہ چلتا یہ خاک دان میاں

نظر میں تاب کہاں اُس کو دیکھنے کے لیے
یہ دل ہے جس کی تجلی کا راز دان میاں

پڑی دراڑ کہاں اور کہاں لگے جالے!
کبھی خبر ہی نہ لی چھوڑ کر مکان میاں

بڑھا کے فاصلہ دیکھا تو دور سے آکاش
زمیں سے ملتا نظر آیا آسمان میاں

احمد سبحانی آکاش

غزل

انصر حسن

بدن بیکل نہ گردش میں لہو ہے
یہ کیسا خوف میرے چار سو ہے

ابھی جو دور ہے وہ روبرو ہے
جو پہلو میں ہے اس کی جستجو ہے

تمہارے دم سے میری زندگانی
تمہارے دم سے میری آبرو ہے

سمندر سے الجھتی ہے ہمیشہ
یہ کتنی لا ابالی آب جو ہے

وہ تو ہے جو پسِ پردہ کھڑا ہے
وہ میں ہوں سر پھرا جو کو بکو ہے

ہماری بات کوئی کیا سنے گا
بڑی پھیکی ہماری گفتگو ہے

ہمارے دل میں ہے تصویر تیری
ہماری آنکھ میں بھی تو ہی تو ہے

غزل

دل گشادہ ہے ، لب کشائی نہیں
جُرأتِ عشق ہم کو آئی نہیں

ہم تری دید سے جو ہیں محروم
ایسے لگتا ہے عید آئی نہیں

اپنی دیوانگی سے خوف زدہ
بات خود کو کوئی بتائی نہیں

خود پہ موقوف یہ شفیق کیا
خاک میں خاک پھر ملائی ہیں

محمد شفیق انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اس بلندی پہ ہم نے پڑاؤ کیا
جس کے آگے فقط پستیاں رہ گئیں

غزل

تمھیں پتہ ہی نہیں ہے کہ کیا ہے کونے میں
دُکھوں کو باندھ کے رکھا ہوا ہے کونے میں

اب اُس کی یاد مرے ساتھ یوں لپٹ گئی ہے
کہ جیسے بچہ کوئی سو رہا ہے کونے میں

نکل کے خود سے کہیں اور مَیں چلا گیا ہوں
وہ مَیں نہیں ہوں، کوئی دوسرا ہے کونے میں

کھُلی فضا میں جو مُرجھا کے گرنے والا تھا
وہ زرد پھول بھی کِھلنے لگا ہے کونے میں

یہاں جو روشنی پھیلی ہوئی ہے چاروں طرف
کہیں چراغ محبت جلا ہے کونے میں

کسی کے ہونے کا جیسے گماں گزرتا ہے
وہ بار بار اُدھر دیکھتا ہے کونے میں

کسی کا خواب سرِ بام ہو گیا ہے ظہور
کسی کا خواب ابھی تک پڑا ہے کونے میں

ظہور چوہان

غزل

پیکرِ نور تہِ خاک چھپا کر لوٹے
اک اثاثہ تھا دل و جاں کا لٹا کر لوٹے

ایک مینار تھا مسجد کا زمیں بوس ہوا
اک نگینہ تھا جو مٹی میں دبا کر لوٹے

ایک دن آئے تھے وہ قتل کو شمشیر لیے
لاش پھر اپنی ہی کاندھوں پہ اٹھا کر لوٹے

اس کے ہر لفظ سے انوار کی ترسیل ہوئی
لوگ آنکھوں میں نئے دیپ جلا کر لوٹے

خواجۂ کوٹ مٹھن کی تھی سریلی کافی
بزمِ دل سوزاں کو آخر وہ رلا کر لوٹے

اول اول تو اڑی خوب ہنسی لہجے کی
آخرش دھاک سخن کی وہ بٹھا کر لوٹے

رات بھر جام چلے، فتح کے نقارے بجے
روند کر پھر نئی بستی کو عسا کر لوٹے

میری آنکھوں میں بھی برسات کی رم جھم تھی رضا
اپنی جب درد کہانی وہ سنا کر لوٹے

رضا اللہ حیدر

غزل

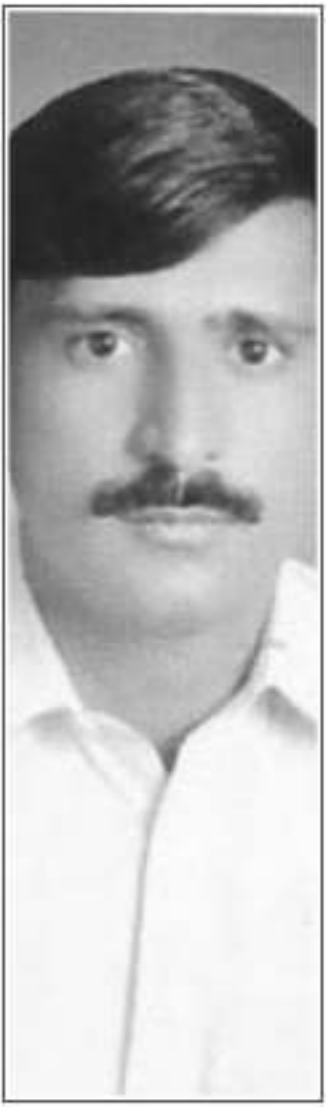

فرقت میں تیری جاگتا رہتا ہوں رات بھر
تاروں کی سمت دیکھتا رہتا ہوں رات بھر

بے حال کر دیا ہے غمِ یار نے مجھے
بالوں کو اپنے نوچتا رہتا ہوں رات بھر

کیا جانے کون شام تمنا میں کھو گیا
ظلمت میں کس کو کھوجتا رہتا ہوں رات بھر

مدھم سی روشنی میں چراغِ فراق کی
تصویر تیری دیکھتا رہتا ہوں رات بھر

کیا حال کر دیا ہے ترے عشق نے مرا
تنہائیوں میں بولتا رہتا ہوں رات بھر

تیرے سوا نہیں ہے مری کوئی آرزو
تجھ کو خدا سے مانگتا رہتا ہوں رات بھر

میں جانتا ہوں یاد وہ رکھتا نہیں مجھے
دانش میں جس کو سوچتا رہتا ہوں رات بھر

اعجاز دانش

غزل

تیری شاہی تو نہیں میرے خدا مانگی تھی
میں نے بیٹی کے مقدر کی دعا مانگی تھی

تجھ سے مانگی ہی نہیں بادِ صبا کی نعمت
موسمِ حبس میں تھوڑی سی ہوا مانگی تھی

اس کی پاداش میں خورشید خفا بیٹھا ہے
میں نے جگنو سے اندھیرے میں ضیا مانگی تھی

وہ ہی دو چار سی خوشیاں وہ ہی تھوڑا سا سکوں
یوں بھی تقدیر کہاں سب سے جدا مانگی تھی

صاف گوئی مجھے لاحق ہے مرے اچھے طبیب
بس اسی واسطے اچھی سی دوا مانگی تھی

جبر کے نیزے مری آنکھوں سے نم کھینچتے ہیں
یاد جب آتا ہے زینب نے ردا مانگی تھی

اک رحیمی کی فراوانی کا شہرہ سن کر
خوئے بخشش نے بھی چھوٹی سی خطا مانگی تھی

لوگ جس وقت خموشی کی گھٹن سہتے تھے
میں نے اس وقت محبت کی صدا مانگی تھی

مانگتا میں بھی اگر کرتہ میسر آتا
جیسی یعقوب نے مالک سے شفا مانگی تھی

آدھے رستے کی مسافت سے مسافر پہ کھلا
صبر کے بجھتے چراغوں نے بقا مانگی تھی

مُسترد اِتنی ہوئیں میری دُعائیں دانش!!!
کچھ بھی اَب یاد نہیں! کب، کہاں، کیا، مانگی تھی

دانش عزیز

غزل

جسے کہتے ہو تم تدبیر میری
ہے وہ بھی اصل میں تقدیر میری

مصور کے تصور کی سراپا
نشانی بن گئی تصویر میری

سراسر ہوں نوشتے کے مطابق
جو سوچو ، کچھ نہیں تقصیر میری

اگر سمجھو مشیّت کا اشارہ
مری رُسوائی ہے توقیر میری

میں لکھے پر دوبارہ لکھ رہا ہوں
قسم سے یہ نہیں تحریر میری

الستی مے کے ہیں سارے کرشمے
خموشی کیا ہے ، کیا تقریر میری

گمانِ اختیاری ، جبر میں ہے
کُھلی رکھی گئی زنجیر میری

فرشتوں کا مخالف رائے دینا
تھی مجھ سے پہلے بھی تشہیر میری

مرا ہونا تو پہلے کر لو ثابت
کرو پھر شوق سے تکفیر میری

سمجھ فیضانؔ رمزِ ''کنت کنزاً''
اگر منظور ہے تفسیر میری

فیض رسول فیضان

غزل

درد و غم کا علاج کیسے ہو
چاہتوں کا رواج کیسے ہو

کل تو جو حال بھی تمھارا تھا
یہ بتاؤ کہ آج کیسے ہو

فرصتِ زندگی نہیں ہم کو
پھر بھلا کام کاج کیسے ہو

یہ بھی حصہ ہے زندگانی کا
ختم آخر سماج کیسے ہو

اِتنی مہنگائی میں بھلا سوچو
گھر میں وافر اَناج کیسے ہو

ہم کو عزّت ندیم ہے درکار
سر پہ شہرت کا تاج کیسے ہو

ریاض ندیم نیازی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آنکھیں خوشبو کی طرح اُٹھ کے بکھر جاتی تھیں
جانے کس موج میں وہ جانِ صبا اپنا تھا

غزل

فلک گرانے زمیں سے شروع ہو جاؤ
اٹھاؤ تیشہ کہیں سے شروع ہو جاؤ

کسی گماں کو ہے ممکن بنایا جا سکتا
بس ایک بار یقیں سے شروع ہو جاؤ

حسابِ شاہ اگر کر سکو تو بسم اللہ
فقیرِ گوشہ نشیں سے شروع ہو جاؤ

سروں کی فصل ہے اور بے دریغ کاٹنی ہے
چلو یسار و یمیں سے شروع ہو جاؤ

خود اپنے ہاتھ سے بھرنا ہے پیٹ دوزخ کا
نکل کے خلدِ بریں سے شروع ہو جاؤ

سفر بخیر ، ہے انجامِ کار نیک تو پھر
جہاں کھڑے ہو وہیں سے شروع ہو جاؤ

پڑھو "بیاضِ" محبت ٹھہر ٹھہر کے شہاب
غزل کے بابِ حسیں سے شروع ہو جاؤ

شہاب صفدر

غزل

لہو میں عکسِ دیرینہ کی جھلمل ڈل سے آتی ہے
ہم اُس خوشبو میں رہتے ہیں جو حضرت بل سے آتی ہے

کوئی آواز پیہم وقت کی اوجھل سے آتی ہے
نویدِ صبحِ نصرت آنے والے کل سے آتی ہے

نگہ دارِ اخوت ہیں جواں اُدھڑے ہوئے سینے
یہ کیسی سرخ رو مٹی ہے جو مقتل سے آتی ہے

نکل سکتے ہیں استصوابِ رائے سے کئی رستے
عدو کو موت لیکن مسئلے کے حل سے آتی ہے

مگر اقوامِ عالم کی گراں گوشی نہیں جاتی
لہو کی چاپ ورنہ ہر گزرتے پل سے آتی ہے

احمد حسین مجاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چشمِ نم جن پہ تھے اہلِ دل ، اہلِ غم
آج ان بستیوں کے نشاں بھی نہیں

غزل

واجد امیر

کیوں ساتھ ہی پھرتی ہے پریشانی ہماری
کس نے اسے سونپی ہے نگہبانی ہماری

سجدوں سے لپٹتی ہوئی پیشانی ہماری
پلکوں سے گراتی ہے پشیمانی ہماری

دیکھا نہ کبھی ہم ہیں یہیں پاس تمہارے
دیکھی نہ کبھی چاک گریبانی ہماری

کچھ لوگ محبت سے ہمیں دیکھ رہے ہیں
اک پل کو سہی، ہے تو یہ سلطانی ہماری

منظر کوئی معیارِ نظر تک نہیں پہنچا
آنکھوں میں پڑی رہ گئی حیرانی ہماری

اِک سانس کی بھی خود سے رعایت نہیں کرنی
ہم پر ہی نہ چڑھ دوڑے یہ طغیانی ہماری

سب عقل دھری رہ گئی دیوارِ گماں پر
کس اوج پہ لے آئی یہ نادانی ہماری

اس ڈر سے نہ بھایا کوئی فرصت سے بھرا پل
مشکل میں نہ ڈالے کہیں آسانی ہماری

غزل

صفوں میں اپنی یہ کیوں انتشار باقی ہے
دلوں میں لگتا ہے اب تک دراڑ باقی ہے

ملول کیوں ہے قیامت ابھی نہ آئے گی
ابھی جہاں میں بہت سارا پیار باقی ہے

تم آئے تو ہو بظاہر ہماری محفل میں
مگر تمہارا ابھی انتظار باقی ہے

یہ کیسے مان لیں ہے قحط سالی دنیا میں
ہماری آنکھوں میں تو آبشار باقی ہے

وبالِ جاں نہیں نعمت ہے مجھ کو بیماری
تمہارے جیسا جو تیمار دار باقی ہے

عجیب بات ہے ذکر ان کا ہو رہا ہے اور
نظامِ گردشِ لیل و نہار باقی ہے

کرے ہے بھیک بھی مجھ سے وہ اس غضب سے طلب
کہ جیسے اس کا پرانا ادھار باقی ہے

یہ کیا، ہے عمر تو اس کی خزاں رسیدہ مگر
ابھی تک اس کے بدن پر بہار باقی ہے

میں دنیا بھر میں تو معروف ہو چکا ہوں "ذکی"
بس اپنا گاؤں اور اس کا جوار باقی ہے

ذکی طارق

غزل

جہاں تھا ذکر برق و آشیاں کا
وہ حصہ پھر سناؤ داستاں کا

یہاں بارش سے پہلے بستیاں تھیں
مکیں ہے کھوج میں کچے مکاں کا

جسے سورج سمجھتا ہے زمانہ
دہانہ ہے کسی آتش فشاں کا

ترا ملنا بچھڑنا یاد ہے بس
مجھے بھولا ہے سب کچھ درمیاں کا

عجب خواہش افق پر جا کے دیکھوں
گلے ملنا زمیں سے آسماں کا

جو میرے اور اس کے درمیاں ہے
وہی رشتہ ہے اکرم جسم و جاں کا

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

برق رَو راہ برو! لوگ رہے جاتے ہیں
مگر اے راہ گرو! فرصتِ تاخیر کہاں

غزلیں

اُڑتے اُڑتے شام ہوئی تو گھر لوٹے
روشنی جب تمام ہوئی تو گھر لوٹے

رسوائی کا دیکھا خواب تو آنکھ کھلی
عزت جب نیلام ہوئی تو گھر لوٹے

دھیرے دھیرے یاد آیا گھر کا رستہ
دھیرے دھیرے شام ہوئی تو گھر لوٹے

نام کمانے گھر سے نکلے تھے لیکن
قسمت جب ناکام ہوئی تو گھر لوٹے

سوچا تھا بک جائیں گے ہم بھی افضل
ہستی جب بے دام ہوئی تو گھر لوٹے

افضل ہزاروی

حیرت کے امکان بناتا رہتا ہوں
کچھ منظر ویران بناتا رہتا ہوں

کوئی تو ان میں پھول سجانے آئے گا
سارا دن گلدان بناتا رہتا ہوں

پتھر جیسے خواب سجاؤں آنکھوں میں
مٹی کے ارمان بناتا رہتا ہوں

ادنیٰ سا اک شاعر ہوں میں لاکھوں میں
اپنی اک پہچان بناتا رہتا ہوں

بن جاتی ہے جب اس کی تصویر تو پھر
ہونٹوں پر مسکان بناتا رہتا ہوں

گاؤں کی جب بھی یاد ستاتی ہے افضل
کھیت، شجر، دہقان بناتا رہتا ہوں

غزل

حیات ایسے گزاری جا رہی ہے
کہ یہ بیکار ساری جا رہی ہے

مکانِ دل ہے گرد آلود کتنا
مگر صورت سنواری جا رہی ہے

اِرادے خودکشی کرنے لگے ہیں
تمنا دل میں ماری جا رہی ہے

بڑا پرسوز عالم ہے وہاں کا
جہاں تک آہ و زاری جا رہی ہے

الٰہی! عدل کی میزانِ برحق
زمیں پر کب اتاری جا رہی ہے

زمانہ معترف جس کا کبھی تھا
وہ رسمِ دوست داری جا رہی ہے

اِسی رستے پہ منزل ہے خیالی
جدھر اپنی سواری جا رہی ہے

زبیر خیالی

غزل

کیا کثافت ہے یہ کثافتِ عشق
مار دیتی ہے سب لطافتِ عشق

آئنے میں بھی خود کو دیکھتے ہو
تم نہیں جانتے ثقافتِ عشق

دھڑکنوں کا سرور بڑھتا ہے
دل میں آئے اگر اضافتِ عشق

دشت میں رہ کے سب پہ کھلتا ہے
چلتی رہتی ہے کیوں خلافتِ عشق

حسن شہ سرخیوں میں رہتا تھا
قیس کرتا تھا جب صحافتِ عشق

کور چشموں کو عمر بھر فیصل
نظر آتی نہیں شرافتِ عشق

عزیز فیصل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کوئی پوچھے تو کہیں غیر تھا یا اپنا تھا
ایک چہرے کے سوا شہر میں کیا اپنا تھا

غزل

ہو چکا ہے جو ترے بعد پرانا دیکھے
آئے دنیا مری آنکھوں کا زمانہ دیکھے

روشنی پھوٹ پڑی ہے تری حدت کے طفیل
زندگی لوٹ کے آئے میرا شانا دیکھے

چند لمحوں کی رفاقت میں بنایا ہے اسے
کوئی آئے تری یادوں کا خزانہ دیکھے

رونے لگتے ہیں نئے درد مرے سینے میں
جب مری سمت کوئی رنج پرانا دیکھے

رخسانہ فیض

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خاک پر خاک کی ڈھیریاں رہ گئیں
آدمی اُٹھ گئے ، نیکیاں رہ گئیں

دو غزلہ

سَو راستے ہیں پیشِ نظر کائنات میں
جائے تو کوئی جائے کدھر کائنات میں

یہ شش جہات میں مری پہلی اڑان ہے
کھولے ہیں پہلی مرتبہ پر کائنات میں

ہے کائناتی گرد اڑائی ہوئی مری
اتنا رہا ہوں گرمِ سفر کائنات میں

تیری نگہ سے ہوتی ہوئی دل میں آئی تھی
دل سے نکل کے پھیلی خبر کائنات میں

سیّارگی ستارگی سے فیض یاب ہے
روشن ہے تجھ سے میری سحر کائنات میں

جس کی جڑیں زمین میں، شاخیں فلک میں ہیں
غم ہے وہ ارتقائی شجر کائنات میں

بے منظری کا حبس اضافہ پذیر ہے
پیدا کریں دریچہ و در کائنات میں

یہ ہم ہیں جن کا پھیلنا ردِّ کشش سے ہے
تم ہو کشش کے زیرِ اثر کائنات میں

دروازے کھلتے جائیں گے اَسرار کی طرح
چاہے قدم اٹھاؤ جدھر کائنات میں

ہر دل کا حال و ماضی و مستقبل اور ہے
یکساں نہیں سمے کا سفر کائنات میں

دُوری ہزار نُوری برس کی بھی ہیچ ہے
دل دل سے ربط میں ہے اگر کائنات میں

ہم شب کے واقعاتی اُفق کے قریب ہیں
رہتا ہے انہدام کا ڈر کائنات میں

خوابوں کی شمسی کشتیاں غرقاب ہو نہ جائیں
ہیں جا بجا سیاہ بھنور کائنات میں

ہم پھر بھی کائنات کے مرکز میں ہی رہے
جتنا پھرے اِدھر سے اُدھر کائنات میں

میں ایک بے خیالی کے لمحے کا وہم ہوں
ہر ذہن سے ہے میرا گزر کائنات میں

ہم خوف کی تجاذبی لہروں میں بہہ گئے
برپا تھا ایک سیلِ خطر کائنات میں

پھیلاؤ میں رہے کبھی سمٹاؤ میں رہے
دو حالتوں میں کی ہے بسر کائنات میں

حیرت کا ایک لا مُتناہی طلسم ہے
اٹھتی ہے جس طرف بھی نظر کائنات میں

خواہش کے خس کدے کو جلاؤ گے اب کہاں
شعلہ ہے ذات میں نہ شرر کائنات میں

کیا جانے آشنائی میں کتنا سمے لگے
اب تک تو اجنبی ہے بشر کائنات میں

رہنا کرے پسند اگر کائنات میں
خالق کا ہم بنائیں گے گھر کائنات میں

چاہو تو اُس پہ چلتے رہو نُور کی طرح
اک خطِ مستقیم ہے ہر کائنات میں

تصویرِ شش جہات میں ہم بھی ہیں، تم بھی ہو
یکجا ہیں سارے عیب و ہنر کائنات میں

ممکن ہے، میری ذات میں اک اور ذات ہو
جیسے ہے کائناتِ دگر کائنات میں

دم بھر نمود کرتا ہے دریا میں بلبلہ
بے مائیگی اٹھاتی ہے سر کائنات میں

اجزائے کائنات سی آزادگی کہاں
یکجائی کے لیے نہ بکھر کائنات میں

ہم آخری کنارے پہ تو خیمہ زن نہیں
رہتا ہے کیوں پھسلنے کا ڈر کائنات میں

پھیلاؤ ہے سیاہ توانائی سے یہاں
وسعت ہے دُوریوں کا ثمر کائنات میں

ہر رُخ سے تاب کار اُداسی کا وار ہے
کب تک رہو گے سینہ سپر کائنات میں

ہم سے زمانوں بعد بھی طے ہو نہیں سکی
یک گام تھی جو راہ گزر کائنات میں

اُن کے کرم کا سایہ ہے سب عالمین پر
اُن کے قدم کا نقش ہے ہر کائنات میں

بس ایک تُو ہے نُورِ سماوات و اَرض کا
بس ایک روشنی ہے امر کائنات میں

شاہد تمام مشرق و مغرب اُسی کے ہیں
کیا سوچنا کہ رُخ ہے کدھر کائنات میں

شاہد ماکلی

غزلیں

میری خاطر ترے ہونٹوں سے دعا ہو جاتی
بخدا شہر میں اک جنگ بپا ہو جاتی

بس اسی وجہ سے دو بار مَیں ناکام ہوا
پاس ہوتا مَیں، تو استانی جدا ہو جاتی

ایک ثروت تھا سمندر میں گرا، ڈوب گیا
وہ نہ گرتا تو یہاں موت رہا ہو جاتی

خودکشی کرتے سمے خط نہیں چھوڑا میں نے
ایسا کرنے سے مری موت خفا ہو جاتی

ایک طرفہ کی محبت میں بکھرنے والے
سب یہی کہتے ہیں اے کاش عطا ہو جاتی

یہ گزارش ہے سخن کی کہ ہماری یہ غزل
اس کی دہلیز کے طائر کی نوا ہو جاتی

عثمان حنیف

وہ ہم سے اپنی وفا کی قبور مانگتے ہیں
جو کوئی دے نہیں پاتا، حضور مانگتے ہیں

ہمارے ذہن کا ادراک کھو چلا کیونکہ
یہ عشق جی، مرا مجھ سے شعور مانگتے ہیں

ہمارے درد کا آوازہ اتنا عمدہ ہے
ہمارے نالے کو سارے طیور مانگتے ہیں

کھلے کھلے سے نہیں کرتے رسمِ عشق وجنوں
ہم اس کے نام کو بینِ سطور مانگتے ہیں

تغیرات ضروری ہیں زندگی کے لیے
سو ہم بھی تھوڑے نئے سے فتور مانگتے ہیں

ہمارا ساقی ہے ایسے کمال کا حامل
جو مانگتے نہ ہوں وہ بھی ضرور مانگتے ہیں

ترا سکوت مرے شور کے مماثل ہے
کہ دونوں مجھ سے شراب و سرور مانگتے ہیں

ہمارے حضرتِ واعظ بھی کتنے سادہ ہیں
جو حکمِ یار کی تکمیل، حور مانگتے ہیں

سنا ہے کل میاں عثماں بھی چل دیے مسجد
تو گویا جام سے تھک کر طہور مانگتے ہیں

غزل

کچھ اور اور آئینہ لگنے لگا مجھے
خود میرا عکس آپ سا لگنے لگا مجھے

دیوانگی میں مشکلیں آسان ہو گئیں
دیوار میں بھی راستہ لگنے لگا مجھے

حسنِ خیال یار کو باندھا ہے شعر میں
کتنا حسین قافیہ لگنے لگا مجھے

یوں تلخیوں کے زہر نے لاچار کر دیا
دل کا دھڑکنا معجزہ لگنے لگا مجھے

دیکھا ہے جب سے اپنے گریبان کی طرف
سارا جہان پارسا لگنے لگا مجھے

کچھ اس طرح سے آجکل کٹتے ہیں روز و شب
یہ زندگی بھی سانحہ لگنے لگا مجھے

دیکھے ہیں عقل و فکر پہ تالے پڑے ہوئے
کشتی کا بوجھ ، ناخدا لگنے لگا مجھے

یوں چاہتوں میں بے کراں کٹھائیاں ملیں
دل ہر جگہ بے آسرا لگنے لگا مجھے

بے رنگ ، بے قرار ہے دشوار زندگی
آسودگی سے فاصلہ لگنے لگا مجھے

کج فہمیاں شعور کی قوت کو کھا گئیں
اک راکھشس بھی دیوتا لگنے لگا مجھے

راہِ جنوں پہ درد بھی فیصل بھلے لگے
رنج و الم بھی خوشنما لگنے لگا مجھے

فیصل زمان چشتی

غزل

راستے خوف سے بھرے ہوئے ہیں
لوگ اندر سے سب ڈرے ہوئے ہیں

وقت بدلا کہ آئنہ بدلا
وہ جو پہلے تھے دوسرے ہوئے ہیں

زخم ہی زخم ہو گئے ہیں ہم
درد ہی درد سے بھرے ہوئے ہیں

کچھ تو ایسا ہوا ہے جس کے سبب
اپنے سائے سے بھی ڈرے ہوئے ہیں

سامنا کیا ہوا کسی سے سحر
مندمل زخم بھی ہرے ہوئے ہیں

نادیہ سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

میں کہ مفہوم ہوں پہنائی کا
دشت سمجھیں نہ سمندر مجھ کو

غزل

اس دل کے گزرگہ سے گزر جائیں گے اک دن
یعنی کہ جو زندہ ہیں وہ مر جائیں گے اک دن

امید پہ موقوف ہے یہ رونقِ دنیا
صحرا میں بھٹکتے ہوئے گھر جائیں گے اک دن

یہ کون سخی دشتِ اذیت میں کھڑا ہے
لینے کو قدم اس کے شجر جائیں گے اک دن

تم نے تو یہ سمجھا ہے کہ دیوار بنے ہو
جانے کے نہیں لوگ مگر جائیں گے اک دن

ایوانِ تمنا میں کوئی جشن بپا ہے
کہرام مچے گا جو ادھر جائیں گے اک دن

ہم خاک بہ سر پھرتے ہیں آندھی کے مقابل
ہم لوگ تری رہ میں بکھر جائیں گے اک دن

نکلے گا عصا لے کے کوئی ہاتھ میں اصغر
فرعون صفت لوگ بھی ڈر جائیں گے اک دن

اصغر علی بلوچ

غزل

تیرا گر مان بھی نہیں ہوتا
اتنا ہیجان بھی نہیں ہوتا

چھوڑ دینا کسی کو رستے میں
اتنا آسان بھی نہیں ہوتا

میں کسی کے بھی چھوڑ جانے پر
اب تو حیران بھی نہیں ہوتا

اپنی رکتی ہوئی روانی پر
دل پریشان بھی نہیں ہوتا

ہجر کچھ اس طرح کی ہجرت ہے
ساتھ سامان بھی نہیں ہوتا

جتنا میں لگ رہا ہوں چہرے سے
اتنا انجان بھی نہیں ہوتا

قائدے گر نہ توڑتا آدم
ایک انسان بھی نہیں ہوتا

خوف کے بت نہیں بناتے تو
آج بھگوان بھی نہیں ہوتا

عمران اعوان

غزل

حالات سے گھبرا کے پریشاں نہ ہوا کر
دامن ہو اگر چاک تو پھر خود ہی سیا کر

شاید کہ مصور کو تسلی نہیں ہوتی
ہر بار مٹا دیتا ہے تصویر بنا کر

آ جائیں سرِشام وہ گھر لوٹ کے شاید
بیٹھے ہیں تصور میں ترے گھر کو سجا کر

پتھر مجھے کہتے ہیں مرے چاہنے والے
میں موم ہوں دیکھو تو مجھے ہاتھ لگا کر

محمد اشفاق بیگ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کر لیا خون میں تحلیل مجھے تم نے تو
تم نے تو روپ بھی فنکار کا بھرنے نہ دیا

غزلیں

فتنہ ہے، تعصب ہے، بندوق ہے، گولی ہے
اس شہر میں ہر لحظہ بس خون کی ہولی ہے

اک نام لیا اُس نے کچھ ایسی محبت سے
گویا مرے کانوں میں شیرینی سی گھولی ہے

پت جھڑ کی وہی شامیں، آنسو بھی نظر آئے
یادوں کی کوئی کھڑکی جب آنکھ نے کھولی ہے

اک بار نظر بھر کے دیکھا ہے مجھے اُس نے
اک آن میں یہ ہستی مخمور ہے ڈولی ہے

میرانہ تھا وہ کل بھی، سمجھا ہے یہ اب میں نے
ہر بات محبت کی ادراک میں تولی ہے

جبرانؔ سیہ شب میں وہ مل نہ سکا ہم کو
ہر کنج میں ڈھونڈا ہے، ہر راہ ٹٹولی ہے

وسیم جبران

نہ تم سے کچھ کہوں گا میں، نہ اب تم کو مناؤں گا
تمہیں بس اک نظر دیکھوں گا اور پھر لوٹ جاؤں گا
مرے بس میں اگر ہوتا، جتن کوئی میں کر لیتا
مگر تم دل کی دھڑکن ہو، تمہیں کیسے بھلاؤں گا
عبادت اس سے بڑھ کر اور کوئی ہو نہیں سکتی
کسی روتے ہوئے بچے کو سینے سے لگاؤں گا
اگر ٹوٹے ہوئے پر ہوں، پرندہ اڑ نہیں سکتا
تمہارے شہر سے ہجرت کبھی میں کر نہ پاؤں گا
مرے دشمن سے یہ کہہ دو، مرے معیار تک پہنچے
میں اُس کو گھر بلاؤں گا، اُسے کھانا کھلاؤں گا
کئی پردہ نشینوں کے ابھی کردار کھلنے ہیں
کبھی فرصت ملی تو داستاں اپنی سناؤں گا
ملے گا کچھ نہیں لیکن ذرا تسکین تو ہو گی
میں تصویریں تری سب ہاتھ سے اپنے جلاؤں گا
مجھے معلوم ہے سب کون مجھ کو ورغلاتا ہے
میں اب جبرانؔ اپنے دل کی باتوں میں نہ آؤں گا

غزلیں

صدقہ اے یار کیوں نہیں دیتے
اپنا دیدار کیوں نہیں دیتے

تم مجھے چھوڑ کیوں رہے ہو اب؟
تم مجھے مار کیوں نہیں دیتے

جا رہے ہو تو کچھ تحائف دو
رنج آزار کیوں نہیں دیتے

گھڑی دیتے ہو مجھ کو تحفے میں
وقت سرکار کیوں نہیں دیتے

مجھ کو غم ہی دیا خدائے جہاں
مجھ کو غم خوار کیوں نہیں دیتے

بس ثمر مشورہ ہی دیتے ہیں
ساتھ اب یار کیوں نہیں دیتے

تیرے دل سے فرار چاہتا ہوں
دلربا! میں قرار چاہتا ہوں

تیرے پہلو میں جو گنوا دوں میں
چند لمحے ادھار چاہتا ہوں

غصے میں اور بھی حسین لگو
میں بھی تم سا خمار چاہتا ہوں

جستجو حوروں کی نہیں ہے مجھے
میں تو تجھ کو ہی یار چاہتا ہوں

قصۂ عشق ہو طویل ثمر
باقی سب اختصار چاہتا ہوں

ثمر جمال

غزل

آ گئی آب و تاب ، کانٹوں میں
گل، پڑے بے حجاب کانٹوں میں

پتی پتی بکھر نہ جائے کہیں
پھنس گیا ہے گلاب کانٹوں میں

مفلسی نے اڑائے رنگ و بو
جیسے گزرا شباب کانٹوں میں

نا کہیں . . . تار تار ہو جائیں
زندگی کے ہیں باب کانٹوں میں

رات بھر پھول اوس سے بھیگے
صبح ٹپکی شراب کانٹوں میں

اشک پلکوں سے یوں گرے کوکی!
اٹھ رہے تھے حباب کانٹوں میں

کوکی گل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رکھتا ہے یہاں کون خبر عیب و ہنر کی
خالد ہمیں کس نے نظر انداز کیا ہے

غزلیں

سبھی دشت ہجر کی وسعتیں مرے نام کر کے چلا گیا
وہ جو ایک لمحہ مختصر میں قیام کر کے چلا گیا

میں خزاں رسیدہ بدن لیے رہا منتظر سرِ رہ گزر
وہ محبتوں کی بہار میں کہیں شام کر کے چلا گیا

مری دھڑکنوں کے حصار میں کوئی لمحہ بھر وہ رکا رہا
سبھی زحمت دل زار کو جو تمام کر کے چلا گیا

دل مضطرب کی پکار ہے کہ وہ بے پناہ حسین شخص
مری حسرتوں، مری خواہشوں کو غلام کر کے چلا گیا

جسے ہر نظر سے چھپا کے میں نے رکھا تھا دل میں علی ایاز
وہی چاہتوں بھری داستان کو عام کر کے چلا گیا

محمد علی ایاز

بے لوث محبت نہ مروت سے جڑا ہے
ہر شخص مرے ساتھ ضرورت سے جڑا ہے

اے بندۂ نادان کبھی غور کیا ہے
اک اور جہاں تیری بصارت سے جڑا ہے

دل اور کسی شخص سے مانوس نہیں ہے
جب سے تو مرے گوشِ سماعت سے جڑا ہے

ہے میرے لیے لائق تکریم کہ جب تک
ہر شخص جو تجھ شہرِ محبت سے جڑا ہے

رکھتا ہے مرے قلب کے ہر گوشے کو روشن
اک اشکِ ندامت جو عبادت سے جڑا ہے

غزلیں

کوئی رہبر نہ کوئی زادِ سفر رکھتا ہوں
آس منزل پہ پہنچنے کی مگر رکھتا ہوں

قید ہونے میں نہیں اور برائی کوئی
یہی خفت یہی سبکی ہے کہ پر رکھتا ہوں

دور ابھرتی ہے گلی میں کوئی مانوس سی چاپ
بام سے جھانکتا ہوں کھول کے در رکھتا ہوں

یہ الگ بات مری لاش نہیں ملتی ہے
اپنے اطراف میں تیراک مگر رکھتا ہوں

گویا دنیا میں ہی پا لیتا ہوں جنت اپنی
ماں کی آغوش میں جب لاڈ سے سر رکھتا ہوں

جن کے دامن میں ستاروں کی ضیا ہے احمد
بزمِ احباب میں وہ خاک بسر رکھتا ہوں

احمد محمود

گرد آلود فضا ملنی ہے
ہم کو ورثے میں گھٹا ملنی ہے

کچھ مفادات پہ ہے ضرب پڑی
پورے خطے کو سزا ملنی ہے

جس کے مارے ہوئے پوچھتے ہیں
کب ہمیں تازہ ہوا ملنی ہے

میں رہوں گا کہیں پس منظر میں
وہ مگر نغمہ سرا ملنی ہے

ایک افسوس ازل سے ہے مجھے
ایک تکلیف سدا ملنی ہے

ایک دروازے پہ ساکت ہوں کھڑا
منتظر ہوں کہ ندا ملنی ہے

غزلیں

وہ جس کی لگائی ہوئی ہر شرط کڑی ہے
اُس حسنِ بلا خیز سے یہ آنکھ لڑی ہے

کہنے کو بہت کم ہے ہتھیلی پہ حنا رنگ
انگشت مگر اُس کی نگینے سے جڑی ہے

نت روز تماشا کرے خلقت سرِ بازار
اور زیست کسی چوک میں حیران کھڑی ہے

فرما دیا جو میں نے حقیقت ہے وہی بس
ہاں دُکھ ہے یہی، خلقِ خدا ضد پہ اڑی ہے

ویسے تو سرِ بزم دکھائی نہ دیں آنسو
پلکوں کے دوروں خانہ تو ساون کی جھڑی ہے

اولاد کا ہے فرض اُسے تھام لے فوراً
جس باپ کے ہاتھوں میں بڑھاپے کی چھڑی ہے

صدیوں سے بھی آگے کا سفر یہ تو کرے گا
اِس میرے قلم سے کہاں تلوار بڑی ہے

آفتاب خان

ہونٹ جُنبش نہ کریں، آنکھ میں پانی ہی نہ ہو
کیسے ممکن ہے بیاں، دِل کی کہانی ہی نہ ہو

سُست قدموں سے رواں ہے جو سُوئے موجِ رواں
اُس نے گنگا میں کہیں راکھ بہانی ہی نہ ہو

جس کے کاندھوں پہ کئی صدیوں کا ہے بوجھ لدا
اُس نے یہ لاش کہیں اور دبانی ہی نہ ہو

موم اور دھاگے اُٹھائے وہ چلا آیا ہے
پھر سرِ بزم کوئی شمع جلانی ہی نہ ہو

بَن سنور کر جو نکل آئے ترے شہر کی سمت
ہم نے اِس دشت سے اک شام چُرانی ہی نہ ہو

کِس لیے رختِ وفا باندھ کے گھر سے نکلیں
ہم نے اُس راہ کی گر خاک اُڑانی ہی نہ ہو

جتنی بھی بار سُنیں ہم کو نئی لگتی ہے
یہ محبت کی کہانی تو پرانی ہی نہ ہو

اضطراب اُس کی نگاہوں سے ٹپکتا ہے اگر
یہ کِسی بحرِ طلاطم کی نشانی ہی نہ ہو

اس کی خاموش لبی دل کو ڈسے جاتی ہے
اُسے دریا نہ کہو، جس میں روانی ہی نہ ہو

جانے کِس بات پہ ہر شخص کرے اتنا غرور
کون سی چیز ہے دنیا میں جو فانی ہی نہ ہو

آفتاب اُس کو ابھی یوں ہی پڑی رہنے دے
کِسی نے عدل کی زنجیر ہلائی ہی نہ ہو

غزل

میری امید کا سرچشمہ ہیں آنکھیں اس کی
ان سے پڑھ لیتی ہوں سب شوق کی رمزیں اس کی

گل کروں کیسے یہ جلتی ہوئی شمعیں اس کی
میری یادوں سے بندھی ہیں سبھی شامیں اس کی

صورتِ صبحِ بہاراں ہے سراپا اس کا
موج خوشبو کی طرح ہیں سبھی باتیں اس کی

ضبط جتنا بھی کروں حوصلہ جتنا بھی رکھوں
بعض اوقات رلا دیتی ہیں یادیں اس کی

میری کھڑکی سے چلی آتی ہیں خاموشی سے
صبح کے نور سے پہلے ہی وہ کرنیں اس کی

جس کی تابانی سے روشن ہے افق سوچوں کا
صحبتیں اس کی ہیں مری اور یہ شامیں اس کی

آج تڑپا ہے تو پلٹا ہے مرے دل کی طرف
جانے کس درد میں یوں برسی ہیں آنکھیں اس کی

ضبط کیا سیکھے جسے ہجر رلائے ہر وقت
آہیں کیا رو کے جسے ڈستی ہیں سوچیں اس کی

ڈوبنے سے نہ مجھے روک سکیں گے ساحل
ہیں بھنور اس کے یہ جل اس کا یہ موجیں اس کی

عنبرین اس کی وفاداری پہ نازاں ہوں میں
جھکی رہتی ہیں مرے نام پہ پلکیں اس کی

عنبرین خان

غزل

وقت پڑنے پہ اگر کام نہ آئے دنیا
ایسی دنیا ہے تو پھر بھاڑ میں جائے دنیا

نہ بنی تھی یہ کسی کی نہ ہے بننے والی
پھر بھی ہر شخص یہ کہتا ہے کہ ہائے دنیا

پارسا ہوں کہ گنہگار میں سب جانتا ہوں
میرے بارے میں مجھے کچھ نہ بتائے دنیا

سچ بتاتے ہوئے خاطر میں نہیں لانے کا
جس قدر چاہے بھلے شور مچائے دنیا

کوئی خواہش کوئی لالچ نہ ہوس ہے دل میں
ہم فقیروں پہ عبث سر نہ کھپائے دنیا

ماسوا لہو لعب کچھ بھی نہیں ہے پھر بھی
جس کو لگتی ہے بھلی جائے کمائے دنیا

نہ بنایا ہے نہ دنیا کو بنائیں گے صغیر
سو یہ بنتا ہے ہمیں بھی نہ بنائے دنیا

صغیر احمد صغیر

غزل

صحت ، سکھ ، جوانی مانگی — تیرے حسن کے در تک پہنچوں
قلم ، کتاب ، کہانی مانگی — اف ! کتنی نادانی مانگی

جوش طلب میں جب لب کھولے — یہ انجام تو ہونا ہی تھا
یثرب کی دربانی مانگی — نصرت جو بیگانی مانگی

پانے کی امید کہاں جو — بدل گئے چاہت کے قرینے
منزل تھی ان جانی مانگی — ہم نے ریت پرانی مانگی

دن کے وقت تجھی کو دیکھوں
کب ہے رات سہانی مانگی

نورکمال شاہ

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

اے بتِ زیبا ! تری ضربِ تغافل کی قسم
کرچی کرچی تیرے ، قدموں میں بکھر جائیں گے ہم

غزل

موسم تو سازگار تھا؛ کھلتا ہوا نہ تھا
ایسی تھیں بارشیں کہ الم بھیگتا نہ تھا

وہ شخص بزدلی کی عجب انتہا پہ تھا
ہم کو تو کیا، کسی کو بھی پہچانتا نہ تھا

کیسی اداس رات تھی تارے بھی بجھ گئے
دل تھا کہ آسمان کو بھی جانتا نہ تھا

واعظ کے ہر بیان سے خطبہ الجھ گیا
لفظوں کے واہمے کو کوئی تولتا نہ تھا

دن اتنا تیز رو تھا کہ سورج نہ دکھ سکا
سایا پلٹ کے زیست کو بھی دیکھتا نہ تھا

سوچا کیے کہ یاد پہ مالا چڑھائیں گے
دل چاہتا ضرور تھا پر مانتا نہ تھا

ایسی تھیں آندھیاں کوئی پتہ نہ ہل سکا
دل ایسا منجمد کہ لہو رینگتا نہ تھا

سعدیہ بشیر

غزلیں

کسی کی آنکھ میں رکھ دے مگر چھپا سارے
بکھر نہ جائیں کہیں خواب خوش نما سارے

''میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں''
جو میرے سوگ میں کرتے ہیں اب دعا سارے

یہی تو شہر کا منصف تھا اک زمانے میں
یہ دے رہے ہیں سڑک پر جسے سزا سارے

یہ کس کے ہجر میں رنجیدہ ہیں مہکتے گلاب
کہ پھولدانوں میں لگتے ہیں یوں خفا سارے

سفید چہرے لیے لوگ جی رہے ہیں شمس
چھپا کے داغ جسامت کے بدنما سارے

آفتاب محمود شمس

کبھی تو پھول کبھی خار لکھے جاتے ہیں
کہانیوں میں جو کردار لکھے جاتے ہیں

جو تیرے سامنے چاہت کی بات کر جائیں
دل و دماغ سے بیمار لکھے جاتے ہیں

جفا کے شہر کی پریاں چڑیل جیسی، تو
مکان کوچے پراسرار لکھے جاتے ہیں

وفا کی بات بھی جن کی زباں کو آتی نہیں
یہاں پہ جنگ کے سالار لکھے جاتے ہیں

گلاب سوگ ہوا کرتے ہیں لحد پر شمس
سجیں جو بالوں میں، سنگار لکھے جاتے ہیں

غزلیں

بلا سے دشت چمن کے قریں سمجھتے ہو
وہی حسیں ہے جسے تم حسیں سمجھتے ہو

خود اپنے چار طرف بھی اگرچہ خود ہی ہو
کہیں کہیں تو مجھے بھی کہیں سمجھتے ہو

یہ خاک زادے ستارے ہیں کہکشاؤں کے
یہ آسماں ہے جسے تم زمیں سمجھتے ہو

ہمیشہ پکڑے گئے ہو فریب دیتے ہوئے
زیادہ خود کو ذہین و فطیں سمجھتے ہو

کسی بھی آئنے کو منہ نہیں لگاتے تم
جو نکتہ بیں ہے اسے نکتہ چیں سمجھتے ہو

براہِ راست تخاطب کی راہ ڈھونڈنے کو
فسانہ سن کے حقیقت نہیں سمجھتے ہو

اکرم جاذب

قاعدوں، رسموں، رواجوں میں نہ تعلیم میں ہے
دل کی تہذیب تو جذبات کی تنظیم میں ہے

وقت کی نبض جہاں آ کے ٹھہر جائے گی
ایسا لمحہ بھی مہ و سال کی تقویم میں ہے

اہلِ دنیا سے تصادم میں کھلیں گی آنکھیں
یہ محبت تو ابھی عالمِ تنویم میں ہے

اس نے سوچا ہی نہیں دیس نکالا دیتے
میری ہستی کی بقا عشق کے اقلیم میں ہے

رنج و آلام کی راہوں نے سکھا دی جو مجھے
رمز لفظوں میں نہ لفظوں کے مفاہیم میں ہے

آشکارا اسے کرنا بھی نہ ہو بے ادبی
اک محبت کہ جو خوش پردۂ تعظیم میں ہے

فرض کرتے ہیں چلو خود کو اضافی جاذب
پیش مشکل جب اسے وقت کی تقسیم میں ہے

غزل

ایک تو تھی شہر میں اشکوں کی ارزانی بہت
اور اس پر تھا مری آنکھوں میں بھی پانی بہت

اب کے سب اچھے برے غرقاب ہوں گے ساتھ ہی
اب کے سیلِ آب میں ہونی ہے طغیانی بہت

مجھ کو رونے کے لیے درکار تھا شانہ کوئی
تھی مگر آب و ہوا بستی کی بیگانی بہت

نام لے لے کر کسی کا درد اپنے رو دیے
کام میرے آئی میری مرثیہ خوانی بہت

آدمی کو فرشِ غم پر کھل کے رونا چاہیے
درد رو دینے سے ہو جاتی ہے آسانی بہت

اک دریچہ کھول کر دیکھا جو میں نے شہر کو
یاد آئی مجھ کو اپنے دل کی ویرانی بہت

اک طرف کچھ ٹھان کر بیٹھے ہوئے تھے کچھ چراغ
دوسری جانب ہوائیں بھی تھیں دیوانی بہت

اک شبِ تیرہ کو اپنی تیرگی کے زعم میں
ایک جگنو کی جسارت پر تھی حیرانی بہت

کچھ نہیں کھلتا کہ آخر کو مسافر کیا ہوا
حوصلہ کم کم تھا اور تھی خستہ سامانی بہت

حادثہ ایسا نہیں تھا جس کو بھولا جا سکے
آج بھی سوچوں تو ہوتی ہے پریشانی بہت

خیر سے سرسبز ہے دریا کی منت کے بغیر
کیوں کہ میرے کھیت کی مٹی ہے بارانی بہت

زندگی بھر عشق کرنے کی کبھی ہمت نہ کی
ایک ہی دل تھا سو اس دل کی تھی نگرانی بہت

علمدار حسین

غزلیں

خوف کے کھلتے ہیں ہر سو در ہی در
جب خدا کا ڈر نہ ہو تو ڈر ہی ڈر

کون ظاہر ہو گیا تج کر حجاب
ہر طرف ہیں عاشقوں کے سر ہی سر

کرتے ہیں بے دخل، گاؤں کے مکیں
اور بنا لیتے ہیں اپنے گھر ہی گھر

کوئی خوشیاں لے گیا کر کے شکار
شوق کے ٹوٹے پڑے ہیں پر ہی پر

اب ہو ظاہر لازی، غیبی مدد
ہو گیا دنیا پہ طاری شر ہی شر

اے زمانے دو گھڑی کے عیش کا
سیّد بے بس پہ احساں دھر ہی دھر

حسن پرویز سیّد

جنوں میں خیر، دیوانوں کی یارب
طلب ہے عشق میں جانوں کی یارب

تری طاعت میں جن کا خوں کیا ہے
جزا اُن دل کے ارمانوں کی یا رب

کبھی جن پر کوئی بادل نہ برسا
خطا کیا ایسے ویرانوں کی یا رب

سبھی قاتل اکٹھے ہو گئے ہیں
مدد کر اپنے پروانوں کی یا رب

وہ بارش ہے ،کہ گویا بے خطا ہے
دلِ سیّد پہ احسانوں کی یا رب

غزل

کسی ستارے سا تابندہ ہونا چاہتا ہوں
میں روشنی کا نمائندہ ہونا چاہتا ہوں

میں اپنی ذات کے مدفن میں دفن ہوں کب کا
کسی طلسم سے پھر زندہ ہونا چاہتا ہوں

ہر ایک لمحہ ترا مجھ کو سوچتے گزرے
میں تیرے دھیان میں پائندہ ہونا چاہتا ہوں

بھلائی کیا کی کہ اُلٹا گناہ لازم ہے
میں ایسی نیکی پہ شرمندہ ہونا چاہتا ہوں

خدا کا شکر ہے واعظ کہ پارسائی میں
تری طرح ہوں نہ آئندہ ہونا چاہتا ہوں

قدم قدم پہ ملے لطف منزلوں سا امر
میں ایسی راہ کا جوئندہ ہونا چاہتا ہوں

امر مہکی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس نے مہر کرم چمکایا
پگ پگ دھوپ کا ہن برسایا

غزلیں

لہجے ایندھن بن جاتے ہیں
غم کا کارن بن جاتے ہیں

ہجر میں ٹوٹے دل تو دل کے
ٹکڑے درپن بن جاتے ہیں

ہر موسم سے مل کر دیکھا
نینا ساون بن جاتے ہیں

تم سے نیا رشتہ کیا جوڑیں
رشتے الجھن بن جاتے ہیں

دل میں رہنے والے اکثر
دل کی دھڑکن بن جاتے ہیں

تو جو کھینچے گول لکیریں
میرے کنگن بن جاتے ہیں

بات سمیرا سچ پوچھوں تو
بھولے ساجن بن جاتے ہیں

سمیرا یوسف

یہاں ہجر میں کچھ خسارہ ہوا تھا
وہاں جاں کا نقصان سارہ ہوا تھا

ہوا پیار جن سے ہمیں پہلے پہلے
نیا عشق ان سے دوبارہ ہوا تھا

بنے تھے وہ ہمدرد جس دم ہمارے
دکھوں سے غموں سے کنارہ ہوا تھا

تری یاد میں تیری تصویر دیکھی
یہی ہجر میں غم کا چارہ ہوا تھا

جبیں پر مری ہونٹ رکھے جو اس نے
نمایاں جبیں پر ستارہ ہوا تھا

جدا ہو کے تجھ بن مری جان جینا
گوارہ نہیں نہ گوارہ ہوا تھا

اسے خود سے کیسے جدا ہونے دیتے
دعاؤں سے جو کہ ہمارا ہوا تھا

غزلیں

ہمیں بھی نقل مکانی سے خوف آتا ہے
جہاز ران ہیں پانی سے خوف آتا ہے

کسی کسی کو پتا ہے کہ رات بھیگ چکی
کسی کسی کو کہانی سے خوف آتا ہے

ہماری چھت کو کسی کم نظر کی آہ لگی
کہ اب تو اٹھتی جوانی سے خوف آتا ہے

میں جیسے پھیلتا جاتا ہوں اپنے چاروں طرف
مجھے تو اپنی روانی سے خوف آتا ہے

وہ سانپ جس کا زمانے پہ خوف طاری ہے
اُسے بھی رات کی رانی سے خوف آتا ہے

شعیب عدن

مجھے پتا ہے کہ رستہ کدھر تمام ہوا
ترا بھلا ہو کہ میرا سفر تمام ہوا

دلوں کو زنگ لگا ہے فراق شیشوں کو
عجیب کارِ کثافت میں گھر تمام ہوا

بلا سے اب کوئی آئے اٹھا کے لے جائے
کہ شاہزادی کے اندر کا ڈر تمام ہوا

محبتوں کو بھی دیمک سی کھا رہی ہے عدن
محل تمام ہوا تھا، ہنر تمام ہوا

غزل

یہ جو سب سے الگ کھڑا ہوں میں
سب کے چہروں کو پڑھ چکا ہوں میں

خود سے ملنے کا راستہ ہے یہی
تجھ سے ملنے کو چل پڑا ہوں میں

یاد آئی ہے رفتگاں کی مجھے
اپنی آنکھوں سے بہہ رہا ہوں میں

دکھ یتیمی کا کمسنی میں ملا
اس لیے عمر سے بڑا ہوں میں

یہ بھی کچھ کم نہیں ہے میرے دوست
پیڑ کے سائے میں اُگا ہوں میں

دل ابھی تک ہے بورے والا میں
گرچہ لاہور آ گیا ہوں میں

میرا تجھ پر یقین بڑھتا ہے
جب پرندوں کو دیکھتا ہوں میں

کوئی سنتا نہیں ہے میری بات
ایسے لگتا ہے مر گیا ہوں میں

اک اذیت ہے یہ خموشی بھی
اس لیے روز چیختا ہوں میں

باپ جیسا لگا مجھے اکمل
جب بھی اُس پیڑ سے ملا ہوں میں

اکمل حنیف

غزل

بکھرا ہوا وجود منظم کرے کوئی
احساں یہ مجھ نحیف پہ پیہم کرے کوئی

دو چار دن کا گریہ نہیں عمر بھر کا ہے
میری طرح سے آنکھیں ذرا نم کرے کوئی

تنہا دلوں کی ویسے بھی رکھتا خبر ہے کون
اک بے نوا کے رنج ہیں کیا غم کرے کوئی

محبوب کے مزاج کا ہر رنگ منفرد
شائستگی سے یار کو برہم کرے کوئی

جو تجھ سے دُور ہو وہ کہاں صبر کر سکے
تجھ سے بچھڑ کے کیسے نہ ماتم کرے کوئی

دنیائے ہست و بود کا ہر کونہ چھان دوں
مجھ کو ترا پتہ جو فراہم کرے کوئی

مستحسن جامی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

محفلِ ماہتاب میں نجمِ سحر نہیں تو کیا
لاکھ نیاز مند ہیں ، ایک اگر نہیں تو کیا

غزل

اُس وقت اُس جگہ پہ وہی آدمی ملا
سورج کبھی تو میری گھڑی سے گھڑی ملا

اے چاند اپنے عکس کو پانی میں گھول دے
یہ جھیل پُرسکون بنا، روشنی ملا

مدت کے بعد خود سے ملاقات ہو گئی
مدت کے بعد آج کوئی اجنبی ملا

میرے لئے ہی وقت کو یہ وسعتیں ملیں
مجھ کو مرا وجود مگر سرسری ملا

وہ جون کی "گمان" اٹھا سر کو پھوڑ لے
آنکھوں میں خون، خون میں کچھ بے دلی ملا

مشہور! خاندان میں ذہنی مریض ہیں
جن جن کو بھی شعورِ فنِ شاعری ملا

اتنا پتا ہے رات کو سویا نہیں ہوں میں
وہ خواب میں ملا یا مجھے واقعی ملا

دنیا رمیض میرے خیالات میں نہیں
مجھ کو نہ مل سکی، نہ اِسے میں کبھی ملا

رمیض نقوی

غزلیں

عجب اک سلسلہ دیکھا گیا ہے
مجھے سب سے جدا دیکھا گیا ہے

یہ ہیں کچے گھروں کی بستیاں، پر
یہاں اکثر خدا دیکھا گیا ہے

مری آنکھیں تبھی تو جاگتی ہیں
گھروں میں رت جگا دیکھا گیا ہے

جہاں خیمے گڑے ہیں دشمنوں کے
وہاں کل رہنما دیکھا گیا ہے

جو کل تک تھا سرِ مقتل چھپایا
لہو وہ جا بجا دیکھا گیا ہے

مرا خنجر مرے سینے میں اُترا
مجھے مجرم بنا دیکھا گیا ہے

احمد سجاد بابر

فرعونیت کی گرد ہے
لہو بھی کتنا سرد ہے

خمار شب میں چاند کا
حسین چہرہ زرد ہے

جھکے ہوئے ہیں سر سبھی
یہاں پہ کوئی مرد ہے؟

یہ گیت ہے پرندے کا؟
یا گیت اوڑھے درد ہے؟

یہ بھائی میرا ہاتھ ہے
زمین کی نہ فرد ہے

غزلیں

آ دیکھ تیرے دوست کا اب کیسا حال ہے
تنہائیوں میں اب فقط تیرا خیال ہے

میں ساتھ ہوں لیکن انہیں یاد آئے کوئی اور
یہ دیکھ کے جینا ہوا کتنا محال ہے

مستی نہ ہو شراب میں وہ جام کر قبول
محفل میں اس نے کر دیا کیسا سوال ہے

اڑتا ہے آسمان پہ لیکن یہ سوچ تو
ہر روشنی کو ایک دن آتا زوال ہے

بے رنگ سا جہاں مجھے راس آئے نہ عزیز
اس جان کا تو مسئلہ ہجر و وصال ہے

عزیز قدیر مغل

جب تک تیرے کوچے کی زیارت نہیں کرتے
ہم اہل جنوں کوئی عبادت نہیں کرتے

اس سودے میں دل کا ہی تو نقصان کیا ہے
ہم نوکری کرتے ہیں تجارت نہیں کرتے

تم آؤ کسی شام مرے پاس پلٹ کر
ہم شہرِ محبت سے تو ہجرت نہیں کرتے

اک میں ہوں ترے ساتھ کھڑا ہوں جو ابھی تک
تم ہو کہ مری آ کے حمایت نہیں کرتے

طاری ہیں کئے خود پہ ترے نام کے الفاظ
ہم اور کسی کی بھی اطاعت نہیں کرتے

ہوں دفن تری یادیں مری خاک اکٹھے
ہم تنہا تو یادوں کی وصیت نہیں کرتے

غزل

تمہیں یوں یاد رکھنا تھا مکمل بھول جانا تھا
محبت نے دیا کیا تھا جو اب ہم نے گنوانا تھا

تمہیں ملنا نہیں ہم سے تو کب مشتاق ہم بھی تھے
نئے تھے راستے اپنے مگر منظر پرانا تھا

پلٹ کر تم نے دیکھا تھا لبِ خاموش کی جانب
تمہیں جانے کی جلدی تھی مجھے بھی دور جانا تھا

تمہارے دل پہ جو گزری وہی حالت ہماری تھی
گزاری رات جو مر کے تمہیں اسکا بتانا تھا

اذیت کے سوا کیا تھا تمہارے ساتھ رہنے میں
بہت مشکل تھا دل کا ماننا لیکن منانا تھا

بڑی مشکل سے سمجھے ہیں کہیں اب جا کے ہم اسکو
کہ سانپ اور آستیں کا رشتہ بھی کتنا پرانا تھا

نائلہ راٹھور

غزلیں

پو پھوٹے تو چلنے کی تیاری کرتا ہوں
ایک سفر ہے جس کو خود پر طاری کرتا ہوں

پہلے اس کے دل میں درد کا شہر بساتا ہوں
اور پھر اس میں اپنا سکہ جاری کرتا ہوں

جانے کس کی یاد میں آنکھیں روشن رہتی ہیں
جانے کس کے ہجر میں شب بیداری کرتا ہوں

خود ہی کر لیتا ہوں پہلے قتل محبت کو
اور پھر خود ہی بیٹھ کے گریہ زاری کرتا ہوں

روز اسے آنکھوں میں بھر کر روز گراتا ہوں
اکثر یوں بھی اپنی دل آزاری کرتا ہوں

پہلے اک کونے میں ٹوٹے خواب چھپاتا ہوں
اور پھر اس سے ملنے کی تیاری کرتا ہوں

ارشد نعیم

پڑے ہوئے تھے جو ہم تیرے نقشِ پا کے ساتھ
بکھر گئے ہیں کسی اجنبی ندا کے ساتھ

ترا سوال میں اس سے کروں تو کیسے کروں
مکالمہ بھی نہیں ہے مرا خدا کے ساتھ

یہ دیکھتے ہی منڈیروں کے خواب ٹوٹ گئے
مرے چراغ جو بجھنے لگے ہوا کے ساتھ

گئے زمانوں سے مجھ کو پکارنے والے
میں خود بھی ڈوب چلا ہوں تری صدا کے ساتھ

رواں ہیں کشتیاں صبحِ مراد کی جانب
الجھ رہے ہیں مرے بادباں ہوا کے ساتھ

غزلیں

عدن سے نکلا ہوا اِک جہاں سے ہوتا ہوا
زمیں پہ آ گیا ہوں آسماں سے ہوتا ہوا

مرے خمیر میں رکھا گیا درود و سلام
سو ورد کرتا رہا ہر زماں سے ہوتا ہوا

وفا کے دوش پہ اڑتا ہوا حسیں پنچھی
گرا ہے خاک پہ، تیر و کماں سے ہوتا ہوا

خدا سے عشق کا باعث حسین چہرے ہیں
خدا تک آیا ہوں عشقِ بتاں سے ہوتا ہوا

پھر ایک قافلہ بازارِ شام میں پہنچا
صلیبِ تشنگی، نوکِ سناں سے ہوتا ہوا

مجھے بنانا پڑا دل کی سمت اک رستہ
گزر رہا تھا وہ وہم و گماں سے ہوتا ہوا

خدائے عشق! میں تیری جناب میں پہنچا
عذابِ زیست کے ہر امتحاں سے ہوتا ہوا

محسن رضا شافی

دل سے دنیا نکال کر مرے دوست
پھر تو مجھ سے سوال کر مرے دوست

دیکھ میری جبیں پہ لب رکھ دے
میری سانسیں بحال کر مرے دوست

عین ممکن ہے کام آ جاؤں
رکھ لے مجھ کو سنبھال کر مرے دوست

ایک درویش ہنستا جاتا ہے
اپنا کاسہ اچھال کر مرے دوست

دل کے مفتی سے لا کوئی فتوا
ہجر مجھ پر حلال کر مرے دوست

طارق جاوید

غزل

موتیا آنکھوں میں اور چاندی بھلے بالوں میں ہے
پھر بھی تیرے جتلا کا نام دل والوں میں ہے

زندگی کو کاٹتے ہیں جیل کے مانند ہم
موت کی پر لطف ٹھمری کا اثر تالوں میں ہے

نفسیاتی مسئلے سمجھو اگر شوقین ہو
وہ کبوتر خوش نہیں جو سرمئی جالوں میں ہے

جنگ میں آ کر تمہارے جنگجو پر یہ کھلا
گھاؤ جو تیری نظر کا ہے کہاں بھالوں میں ہے

اے سمندر معذرت میں اس لئے ڈرتا نہیں
تجھ سے بھی ظالم بھنور اُن سانولے گالوں میں ہے

اک تمہارا خوف ہے اور اک خدا کا خوف ہے
اپنا دل تو جیسے ڈر کے آتشیں چھالوں میں ہے

دستیابی اصل میں بے قیمتی کا نام ہے
دیوتا کی شکل تک پرساد کے تھالوں میں ہے

سرسری دیکھا تھا اس نے اوڑھ کر جس کو حسن
آج بھی وہ شال سب سے قیمتی شالوں میں ہے

حسیب الحسن

غزل

فراقِ روح سے بس ایک کتبہ بن گیا ہوں
میں اک اجڑی ہوئی بستی کا حصہ بن گیا ہوں

مجھے لگتا نہیں پَر کھول پاؤں گا فضا میں
میں اپنے عشق کا خود ہی نشانہ بن گیا ہوں

سکوں کیا خاک دو گے تم مجھے اے لمحۂ وصل!
مسلسل ہجر کی چوٹوں سے پارا بن گیا ہوں

مری آنکھوں میں ہیں تبدیلیاں سارے جہاں کی
کبھی ناظر کبھی خود ہی نظارہ بن گیا ہوں

جہاں تک ہو سکے تم آزماؤ صبر میرا
مگر پتھر نہیں ہوں اب، میں شعلہ بن گیا ہوں

چھپا کر اس قدر جو تم مجھے رکھنے لگے ہو
میں کب سے اس قدر مہنگا اثاثہ بن گیا ہوں

نکل سکتے ہو تم کیسے حصارِ آرزو سے
تمھارے چار سو چاہت کا ہالہ بن گیا ہوں

سبھی کے رابطہ نمبر ہوئے ہیں جب سے ڈیلیٹ
گماں ہوتا ہے جیسے میں جزیرہ بن گیا ہوں

سرور فرحان

غزل

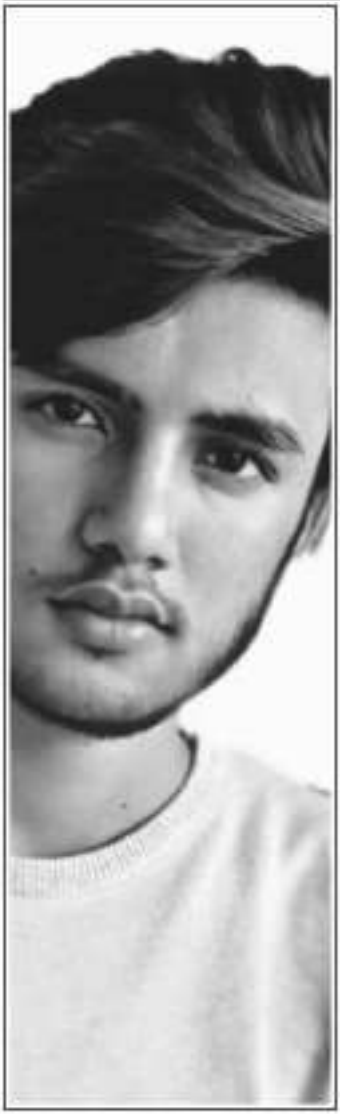

غور سے یہ عجب سماں دیکھو
خوف ہی خوف ہے جہاں دیکھو

شام کو گھر پلٹتے سورج میں
کتنے ہی رنگ ہیں نہاں ، دیکھو

کتنا چپ چاپ لگتا ہے سب کچھ
شام کے وقت آسماں دیکھو

ہے عجب دلکشی بکھرنے میں
آمدِ موسم خزاں دیکھو

ان نشانوں کے پاس ہی ہے فرات
دشت میں خون کے نشاں دیکھو

میں وہیں پر بھٹکتا رہتا ہوں
اپنے دل پر مرے نشاں دیکھو

شاملِ خاک ہو گیا سب کچھ
وہ گلی اور وہ مکاں دیکھو

مہر علی

غزل

چل رہی ہیں یخ ہوائیں
زرد پتے گر نہ جائیں

بے قراری بڑھ رہی ہے
زیرِ لب کچھ گنگنائیں

کوئی بھی محرم نہیں ہے
حالِ دل کس کو سنائیں

جن سے رشتہ ہو وفا کا
دور کیسے اُن سے جائیں

چند لمحوں کی رفاقت
سلسلوں کو کیا بڑھائیں

اب تو اک ہی آرزو ہے
آپ میرے ہو ہی جائیں

حوصلہ شاہد نہیں ہے
دوستوں کو آزمائیں

رانا محمد شاہد

غزل

رنج و آلام سے نِکلوں گا تو مر جاؤں گا
میں ترے دام سے نِکلوں گا تو مر جاؤں گا

اب کوئی کام محبت کے سِوا مُجھ کو نہیں
اب اگر کام سے نِکلوں گا تو مر جاؤں گا

جپ رہا ہُوں یہ ترا نام تو میں زِندہ ہُوں
میں ترے نام سے نِکلوں گا تو مر جاؤں گا

میرے ہونے کی علامت ہے فلک پر یہ شفق
منظرِ شام سے نِکلوں گا تو مر جاؤں گا

منظرِ عام پہ آنے سے یہ اِحساس ہُوا
منظرِ عام سے نِکلوں گا تو مر جاؤں گا

یہ مِرا گھر یہ در و بام مِری زندگی ہیں
جب در و بام سے نکلوں گا تو مر جاؤں گا

میں ہُوں کیفی، مِری دُنیا سے نِکالو نہ مُجھے
گردِشِ جام سے نِکلوں گا تو مر جاؤں گا

محمود کیفی

غزل

شور کیسا ہے دل کی جھانجھر میں
جانے کیا چل رہا ہے بھیتر میں

کیسے کہ دوں کہ میں اکیلا تھا
کوئی چلتا رہا برابر میں

جب تلک پاؤں پانیوں میں رہے
آگ جلتی رہی سمندر میں

شب ابھی اور کتنی باقی ہے
کروٹیں سوچتی ہیں بستر میں

اک توجہ کا آسماں پاکر
کیا اڑانیں ہیں دل کبوتر میں

عکس معکوس ہوگئے سارے
آئنے کھو گئے تھے منظر میں

عمر بھر جانچنے کے بعد کھلا
کوئی انتر نہیں تھا منتر میں

اب وہ کنکر بنے ہیں گلیوں کے
پھول رہتے تھے جن کی ٹھوکر میں

میری امید اس کی ذات سے ہے
جو کھلاتا ہے پھول پتھر میں

زندگی کیا تلاشتی تھی مری
فیصلہ ہو گیا نظر بھر میں

ایک دنیا ہے گھر کے باہر اور
ایک دنیا بسی ہوئی گھر میں

محمد نور آسی

غزل

خوشا اے دل، الم کی یہ فراوانی مبارک ہو
عطائے عشق ہے جو بھی پریشانی، مبارک ہو

وہ جلوہ عکس ہے، معکوس ہے، خود آئنہ ہے وہ؟
تحیر دل کو آنکھوں کو یہ حیرانی مبارک ہو

چلی آئی ہوں دنیا چھوڑ کر، تیری غلامی میں
مرے دل کی مرے شاہا، یہ سلطانی مبارک ہو

تجھے اے دل بھلا بزمِ طرب سے لینا دینا کیا
ہے نسبت قیس سے تجھ کو، بیابانی مبارک ہو

کہاں کا سہل تھا تسخیر کرنا سنگ کو، آخر
کیا ہے موم جس نے، آنکھ کا پانی مبارک ہو

تمہی تھے نا، رہائی کی دعا دیتے تھے لوگوں کو
سنا ہے عشق کے تم بھی ہو زندانی، مبارک ہو

اِسی ہنگامے پر موقوف ہے بس زندگی اپنی
جو برپا کی ہے دل نے، حشر سامانی مبارک ہو

زباں سے کب کہا جاتا اسے، حالِ دروں اُس پر
ہے کھولا جس نے، زخمِ دل کی عریانی مبارک ہو

حصار ان بازوؤں کا ہے حفاظت کے لیے نسریں
میسر ہے اُن آنکھوں کی نگہبانی، مبارک ہو

نسرین سیّد

غزل

عید کے دن بھی جسے یاد خدا کی آئے
اس کے اندر سے مہک کیوں نہ وفا کی آئے

قیمتی لوگ بہت ہم سے ہوئے ہیں رخصت
اب نہ دنیا میں کوئی لہر دعا کی آئے

ایک بھی شخص نہ تھا بات ہماری سنتا
ہم نے مجمعے کے لیے صرف دعا کی، آئے

دل تو کرتا ہے کوئی حمد کہیں، نعت کہیں
جب بھی اشعار میں تاثیر عطا کی آئے

کس طرح ان سے جفا کوشی تصور کر لیں
جن کی جانب سے صدا مہر و وفا کی آئے

کاش رحمت کے برس جائیں یہاں بھی بادل
کاش صحرا میں خبر کالی گھٹا کی آئے

خواب ہو ایسا کہ کھل جائے دریچہ دل کا
لمس پھولوں کا ملے، یاد صبا کی آئے

فخر عباس

غزلیں

دستار دیکھتے ہیں تو سر دیکھتے نہیں
خانہ بدوش لوگ ہیں گھر دیکھتے نہیں

اِک عمر سے کھڑا ہوں کہ دیکھے مجھے کوئی
میری طرف کیوں اہلِ نظر دیکھتے نہیں

رفتار سست کرتا ہے زادِ سفر کا بوجھ
رختِ سفر کو وقتِ سفر دیکھتے نہیں

رونق ہے دیکھنے سے ہی سارے جہان میں
کس کام کی ہے دنیا اگر دیکھتے نہیں

کن پنچھیوں کو دیکھنے آئے ہو تم یہاں
خالی پڑے ہوئے ہیں شجر دیکھتے نہیں

بے کار دیکھتے ہیں اِدھر کو اُدھر کو ہم
جس سمت دیکھنا ہو اُدھر دیکھتے نہیں

سید تیمور کاظمی

کسی کو پا کے بہت خوش تھا پھر جو کھونا پڑا
بڑے سکون میں تھا، بے قرار ہوا پڑا

اسے بھی اشکوں کو پلکوں میں جب پرونا پڑا
ہزار ضبط کیا بے نقاب ہونا پڑا

نہیں ہے عشق کسی رت کسی فضا کا اسیر
یہ بیج فصلِ محبت کا تھا، جو بونا پڑا

سمندروں نے بھی ہم سے تو کج روی برتی
تو خود کو ساحلِ امید پر ڈبونا پڑا

گزر گئی ہے ترے بعد بھی مگر جاناں
یہ بارِ زیست اکیلے ہی مجھ کو ڈھونا پڑا

کسی کو مل گئی منزل کوئی سفر میں رہا
کسی کو ہنسنا پڑا اور کسی کو رونا پڑا

ٹھہر گیا ہے ترا انتظار آنکھوں میں
میں جاگ جاگ کے جب تھک گیا تو سونا پڑا

جو دل کے داغ تھے عرفاں چھپا نہیں پایا
وہ بے بسی تھی کہ اشکوں سے ان کو دھونا پڑا

محمد عرفان خان

غزل

ربطِ پیہم کا اس نے راستہ رکھا
شہرِ حیرت کا در مجھ پر کھلا رکھا

زخم دے کر اسے تو لا دوا رکھا
ضبط میں آگہی کا سلسلہ رکھا

زندہ رکھی تمنا وقتِ آخر بھی
عشق کا حوصلہ جاں سے بڑا رکھا

ملتے رہنا ہے اور میرا نہیں ہونا
زندگی نے الگ ہی فلسفہ رکھا

تم ہو کہ میرے اتنے پاس آ کر بھی
قربتوں میں بدن بھر فاصلہ رکھا

لوٹ جائے نہ وہ پھر سے کہیں مایوس
میں نے در کو ہمیشہ ہی کھلا رکھا

میں، حبیب! اس لیے چپ ہوں، کہ ہر ہر گام
وقت نے ایک تازہ سانحہ رکھا

بشیر احمد حبیب

غزلیں

یہ بھول پن ، یہ طبیعت، یہ عمر شہزادی
زمانہ تیز بہت ہے اور آپ ہیں سادی

کہانی والی پری دیو سے چھڑانی تھی
بڑے ہوئے ہی تھے خاموش ہو گئیں دادی

یہ میرا دل ہے کہ بغداد کا کتب خانہ
جلا کے راکھ کیے دیتی ہے مغل زادی

پھر ایک دن وہ عناصر کو شکل دینے لگا
خدا کے ہاتھ نہیں لگ رہا تھا فریادی

وزیر اور وہ نائی جو سازشی تھے بہت
انہیں بھی شاہ نے رستے میں آگ لگوادی

ادھر کا مال ادھر کرنا آ گیا جب سے
زمانہ مان رہا ہے ہماری استادی

عقیل عباس

ہاتھوں نے پھینک دی یونہی اک تھاپ میز پر
بیٹھے ہوئے تھے گریہ و بر لاپ میز پر

بولی حضور آپ کا کھانا لگا دیا
دیکھا تو جا کے لیٹ گئی آپ میز پر

چھت سے اتر کے بھاگ گئی چیخ صحن میں
کرسی پہ پاؤں رہ گیا اور چاپ میز پر

اک رتجگے کی نظم تھی آنکھوں میں آ گئی
چولہے پہ ماں سنا گئی اور باپ میز پر

شاید کسی نے پاؤں میں چائے رکھی ہے دوست
یونہی تو آ نہیں رہی ہے بھاپ میز پر

غزلیں

تازہ اِس طرح کوئی صُبح کا امکاں کر لیں
کوئی جگنو ہی شبِ غم میں فروزاں کر لیں

تیرے پیکر کی تصوّر میں سجا کر خوشبو
درد کے مارے ہُوئے جشنِ بہاراں کر لیں

اب یہی ایک ہی صُورت ہے مرے دِل زدگاں
چاٹ کر زخمِ جگر درد کا درماں کر لیں

یہ سلیقہ یہ ہنر آتا ہے آتے آتے
کسی حسرت کسی ارماں کو غزل خواں کر لیں

مہرباں آپ پہ ہے وقت کی ترتیب ابھی
جس قدر چاہیں مجھے آپ پریشاں کر لیں

شعر یہ سوچ کے قائل نہیں کہتے ہم لوگ
اِس کو انگشت بہ دنداں اُسے حیراں کر لیں

عمر قیاز قائل

نظر کے زخم جگر تک اُتر گئے ہوں گے
تُو آئے گا تو دُکھی لوگ مر گئے ہوں گے

شکست خُوردہ و دامن بہ ریزہ آہ بلب
ہم ایسے اہلِ وفا کام کر گئے ہوں گے

وہ اِس گماں پہ کوئی تازہ زخم دے جاتے
پُرانے زخم جگر کے تو بھر گئے ہوں گے

ہَوائیں تیز چلیں گی تو طاقِ جاں میں رہے
حیات و موت کی چوکھٹ پہ ڈر گئے ہوں گے

وہی ہے آج بھی میرے چمن کی وِیرانی
زمانے بھر کے خرابے سنور گئے ہوں گے

مِلا سُراغ شبِ طُور میں نہیں جن کو
نہ جانے لوگ وہ قائل کدھر گئے ہوں گے

غزل

نہیں ایسا کمی ہے کوئی یا اچھی نہیں ہے
مگر جو چیز مجھ کو چاہیے ویسی نہیں ہے

ہمیشہ کامیابی ہی ملی ہے مجھ کو اس میں
خسارہ کام وہ ہے جس میں ناکامی نہیں ہے

اگرچہ ثابت و سالم نکل آیا وہاں سے
مگر وہ پہلے جیسی بات جو باقی نہیں ہے

جو چپ ہوں تو نہیں ایسا کہ تجھ سے متفق ہوں
یہ ہاں میں ہاں ملانے والی خاموشی نہیں ہے

نہ رکھ دے خوار کر کے جو، بھلا وہ زندگی کیا
بھلا کس کام کا وہ وقت جو بھاری نہیں ہے

محبت ہی نہیں ہے وہ جو بربادی نہ کر دے
اور اس کو درد کیوں کہنا جو طولانی نہیں ہے

نہیں ہو تم، مگر اور کیا نہیں ہے اب مرے پاس
گو اس میں مجھ کو ذرہ بھر بھی دل چسپی نہیں ہے

بدن کی سیر سے بڑھ کر کہاں ہو گی کوئی چیز
کہ اور اس طور صحت مند سرگرمی نہیں ہے

میں اب بھی سطح پر مرمٹنے والا آدمی ہوں
مگر اب چاہتا ہوں وہ بھی جو سطحی نہیں ہے

رہائش مجھ میں رکھو، اے بھٹکتے پھر رہے درد!
تجھے آبادیوں میں تو جگہ ملنی نہیں ہے

گل فراز

غزل

خوشی غمی سے مرا واسطہ ہی پہلا ہے
کہ خواہشوں کا ابھی سلسلہ ہی پہلا ہے

کسے دماغ تمہیں آنکھ بھر کے دیکھ سکے
تمہاری بزم میں یہ سر پھرا ہی پہلا ہے

معاف کیجیے آداب مجھ کو آتے نہیں
بدن کے ساتھ مرا رابطہ ہی پہلا ہے

وہ بھول جائے گی مجھ کو بڑی سہولت سے
میں کیا کروں کہ مرا تجربہ ہی پہلا ہے

نہیں ہے علم شبِ ہجر کیسے کاٹتے ہیں
کہ میرا عشق، مرا رتجگا ہی پہلا ہے

ہزار لوگ یہاں آئے ہوں مگر انجم
مقام دل میں مرے آپ کا ہی پہلا ہے

امتیاز انجم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیا سچ ہے کہ اک جُھوٹ دکائی نہیں پڑتا
وہ بات کی تفصیل میں جانے نہیں دیتے

سقراط [کہانی]

''بہتا دریا'' بابا عرفان الحق ساتھ تھا، اور ہم ایک لمبے سفر پہ نکلے تھے۔ رُخ جہلم سے نہر کے بہاؤ کے الٹ ''کھڑی شریف'' کی طرف تھا۔ بابا عرفان بولے، جب کبھی کوئی گرہ نہ کھلے تو ادھر آ کے دستک دیتا ہوں۔ گرہ کھل جاتی ہے۔

پوچھا، بابا عرفان، یہ گرہ پڑتی کیوں ہے؟

بولے، جب کبھی خود کو ''تیس مار خان'' سمجھ لو۔ اپنے آپ کو شکتی مان، مان لو۔ خود کو ''اندر راجہ'' سمجھ لو۔ سمجھ لو کہ سب بھید معلوم ہو گئے تو ''گرہ'' پڑ جاتی ہے۔

بہاؤ رک جاتا۔

پھر؟

پھر بہاؤ کے الٹ جانا پڑتا۔

جس جھیل سے پانی اترا ہو، اُس تک سفر کرنا پڑتا۔ بولے، ''جھیل'' تو ایک ہی ہے۔ منبع سب کا ایک۔ اُدھر سے ہی سب ندیاں، نہریں، دریا نکلتے۔ گیان اور عرفان کے۔

پوچھا، کس کی بات کر رہے؟

بولے، ''قرآن'' کی۔

سب بھید اُسے سے کھلتے۔

ہر تالے کی چابی وہ۔

ہر چابی کا کھلتا تالا اُس نے دکھایا۔ جانتے، سب سے بڑا ''تالا'' کون سا؟

پوچھا، بتائیے۔

بولے، اپنی ''میں'' کا۔

سب سے بڑا ''جن'' یہ۔

اسی کو قابو کر لو، تو یہ خود ہاتھ جوڑے کہتا۔

''کیا حکم ہے میرے لیے آقا''

اسی کے قابو آ جاؤ تو یہ ''بندے'' کو شیطان بنا دیتا۔ پھر شیطان مسکراتا اُس میں بولتا۔

بولتے جاؤ۔ تمہارا کہا برحق۔

تم سب سے اعلیٰ، ارفع۔

تم خوبیوں سے بھرے۔

لوگوں نے تمہاری قدر نہیں کی۔

اُٹھو۔

اب، سب کو ''تاراج'' کرو۔

ابدال بیلا

فتنی فتنی کر دو، جو تمہیں نہ مانے اُسے یہی
شیطان ہر "تاجور" کے تاج کے ساتھ اُس
کے ذہن میں پلتا۔ کہتا اوٹ لوسب کو۔
جھنڈے گاڑ دو اپنے۔
جو نہ مانے، اُسے تلف کر دو۔
بن جاؤ، سکندر
سکندر کے ساتھ "اعظم" لوگ خود سے لگا
لیں گے۔
خبردار
"سکندر" نے جس سے درس لیا، اس کا نام
نہ لینا۔
"ارسطو" نہ بننا۔
گرہیں وہ کھولتا۔
تم نے "گرہیں" ڈالنی۔
"ارسطو" کے استاد "پلوٹو" کا نام بگاڑ کے
"افلاطون" کر دو۔ وہ جو علم و گیان کی گدی
کا راجہ تھا، اُسے اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے
والا، "افلاطون" کہو۔
اور سنو۔
خبردار، کبھی "سقراط" کا نام نہ لینا۔
جو سچائی کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا "زہر" پی گیا۔
"زہر" سقراط نے پیا ہوتا تو پتہ
کیا ہوتا؟
وہ مر جاتا۔
وہ تو زندہ ہے۔
آج بھی وہ نئی سوچوں کا سمت نما ہے۔
"قطب تارا" ہے ہر سچائی اور عدل کا۔ اُس
پہ جانے الزام کیا تھا؟

میں نے بابا عرفان الحق سے کہا، آپ
بتائیے۔ بولے۔ اُس پہ مقدمہ چلا کہ تم،
ہماری "یونان" کی نسل کو یونانی دیوتاؤں
اور دیویوں سے دور کر کے، عقل اور خرد سے
سوچنے کا کہتے، تم کہتے، ایک ہی آسمانی
طاقت ہے۔ یہ "گھناؤنا جرم" ہے۔ اس
آسمان پہ "زیوس" براجمان ہوتا ہے۔ اُس کی تین
رانیاں۔ "ہیرا" سیاسی جوڑ توڑ کی دیوی،
اقتدار اُس کی مٹھی میں۔ "ہما" اُس کا پالتو
عقاب، جس کے کندھے پہ بٹھا دے، وہ
بادشاہ "ایتھینا" جنگ و جدل کی آگ
بڑھکاتی۔ "افروڈائٹ" حسن کی دیوی، اُسی
کا بیٹا "اپالو"۔ تم اُن کی نفی کر رہے۔
زہر کا پیالہ پی لو۔
تم نئی نسل کو سوچنے کی ترغیب دیتے۔
تمہارا مرنا ضروری ہے۔
خبردار، ہمارے بنائے لفظوں کو "ڈیفائن"
کرنے کی کوشش نہ کرنا۔
کبھی نہ یہ بحث چھیڑنا کہ "عدل" کیا ہے۔
"انصاف" کی کونپل نئے ذہن نہ اُگاؤ۔
مر جاؤ۔
تم ہمارے کہے، لفظوں کو نئے معنی کیوں
دیتے؟
"عدل" وہی جو ہمارا حکمران کرے۔
"انصاف" وہی جو تم سے ہو رہا ہے۔
زہر پی لو۔
خبردار، ایک قطرہ بھی اس سے نہ گرانا۔
پورا پیالہ پی کے یہیں مرنا ہے تمہیں۔

یہ پیالہ پکڑ کے تم "پلوٹو" سے کیا باتیں کرتے جاتے ہو تمہیں پتہ ہے، ہماری بندرگاہ پہ شاہی بجرہ کل رات تک اترے گا۔
ایک دن، آدھی رات کی تمہیں مہلت ہے۔
تم نے جو بات کرنی ہے "پلوٹو" سے وہ تمہاری آخری بات ہوگی۔
تم اسے "معذرت" کہہ کے کہو۔
کہو، یہ تمہارا قبال جرم ہے۔
وہ "پچانویں اولمپڈ" کا پہلا سال تھا۔
اُس سال کو تین سو ننانوے (399) قبل مسیح بھی کہہ لو۔
سقراط، اُس وقت ستر سال کا تھا۔ اُس نے "فارقیس" کا زمانہ بھگتا تھا۔ "سپارٹا" کی خوفناک جنگ دیکھی تھی۔ انقلاب اور آمریت کے سب دور دیکھے تھے۔ کہنے کو اُس وقت جمہوریت بحال ہوگئی تھی۔ امن کے چار پانچ سالوں سے یونان کے لوگوں کے ذہنوں پہ چربی چڑھ گئی تھی۔ "پلوٹو" اٹھائیس سال کا "سقراط" کا شاگرد تھا۔ وہ اشرافیہ میں سے تھا۔ سیاست میں عملی طور پر قدم رکھنے کا سوچ رہا تھا۔
مگر "یونان" میں طویل خانہ جنگی اور ایران کے ساتھ جنگوں سے خاندان تتر بتر ہو گئے تھے۔ تلخیاں ہر یونانی میں رچ بس گئی تھیں۔
"پیریکل" نے یونان کو سنہرا ثقافتی روپ دینے کے لیے بڑے جتن کیے تھے۔
کھیلوں کے لیے سٹیڈیم بنایا تھا۔ مورتیوں سے یونان کو سجا دیا تھا۔ سب مورتیاں دیوتاؤں اور دیویوں کی تھیں۔ "اپالو" اور "افروڈائٹ" حسن کی دیوی کی مورتیاں۔
ادھر "سقراط" سیاست دانوں کا خاکہ اڑاتا۔
دیوتاؤں اور دیویوں کی توہین کرتا۔
سقراط کے مقدمے کی سماعت کے لیے "پانچ سو ایک" ارکان کی جیوری نے فیصلہ کرنا تھا۔
"سقراط" کے پاس پانی کی گھڑی کے مطابق صرف ایک دن سے کچھ گھنٹے کم وقت تھا۔
"ایتھنز" کے بازاروں میں لوگوں کے اکٹھ باتیں کر رہے تھے۔
کوئی کہتا، "سقراط" کو جلاوطن کر دیں گے۔
کسی کا خیال تھا، وہ بوڑھا بے ضرر منہ زبانی بندہ ہے۔ صرف باتیں کرتا۔ ملک کی جنگ میں جانباز بن کے بھی لڑا وہ۔ وہ "وطن دوست" ہے۔ بری ہو جائے گا۔
کچھ لوگ کہتے، بھئی، یہ جھگڑا پرانا ہے۔
ایک دوکان پہ لوگ باتیں کر رہے تھے۔
وہ ستر برس کا بوڑھا ہے۔
تین بچوں کا باپ۔
بوڑھی اُس کی بیوی۔
کسم پرسی سے زندگی گزارنے والا۔
کبھی کوئی غیر قانون حرکت نہیں کی، ہمیشہ قانون کی پاسداری کی بات کرتا۔ اس بڈھے کو امن سے رہنے دو۔
"سقراط" کے کچھ دشمن آپس میں باتیں کر رہے تھے، اس مقدمے سے ایک ہی خطرہ ہے، یہ بڈھا سقراط، ہیرو بن جائے گا۔ پھر

اُن میں سے کوئی کہتا،
مگر اس کا زندہ رہنا بھی ہماری موت۔
ایک بولا، اور اس موت میں بھی اُس کی زندگی۔
عدالت کی جیوری میں ''سقراط'' پہ بحث ہونی تھی۔
اُس پہ الزام یہی تھا، کہ تمہاری تعلیمات ''گمراہ کن'' ہیں۔
اُسے اپنی صفائی میں بیان دینے کا حق حاصل تھا۔
مقدمے والے دن ''سقراط'' اطمینان کی نیند سے اٹھا، اٹھ کے ورزش کرنے باہر نکل گیا۔
اُس کے چہرے پہ اطمینان کے ڈھیر لگے تھے۔ اُس کے ایک دوست نے لپک کے ''سقراط'' کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔
تم اپنے مقدمے کی تقریر کے لیے تیاری کب کرو گے؟
''سقراط'' نے مسکرا کے اُس سے بازو چھڑایا اور بولا۔
میں ساری عمر اسی کی تیاری کرتا رہا ہوں۔
''ایتھنز'' کے پانچ سو ایک شہری ''قرعہ اندازی'' سے جیوری کے ممبر بنے تھے۔ ان میں ایتھنز کے قصاب، کھیلوں کے تماش بین، کچھ کھلاڑی، سبزی فروش، کچھ کریانہ کی دکانوں والے تھے۔ اُن میں کچھ سیاست دان بھی تھے۔ جو اپنے جلسے جلوسوں میں لوگوں کو یوں اکٹھا کر کے چلتے جیسے مچھیرے مچھلیاں جال میں پھنسا کے پھرتے ہیں - وہ لوگ اپنے عہد کے سب سے خردمند عاقل دانشور ''سقراط'' کی زندگی کا فیصلہ کرنے کے لیے اپنے گھروں سے آئے تھے۔
''جیوری'' کے علاوہ تماش بین بھی عدالت میں بہت جمع تھے۔ ''ایتھنز'' میں ''تماش بینی'' سب سے لذیز شغل تھا۔ وہ تو ''گلیڈیٹرز'' کو ایک دوسرے کے سر کاٹتے دیکھ کے خوشی سے تالیاں بجانے والے تھے۔ اُدھر ''سقراط'' کا مقدمہ دیکھنے بھی آ جمع ہوئے۔
کارروائی کی ابتدا، دعا سے ہوئی،
دیوتاؤں کی توصیف بیان کی گئی،
نقیب نے آواز لگائی۔
ملزم ''سقراط'' حاضر ہو۔
''سقراط'' مسکراتا اٹھ کے ''جیوری'' کے سامنے جا کھڑا ہوا۔
''سقراط'' نے جو بھی کہنا تھا، وہ لفظ بہ لفظ آنے والی نسلوں کو بتانے کے لیے، وہاں ''پلوٹو'' موجود تھا۔
''یونان'' میں اپنی صفائی میں ملزم جو بھی کہتا، اُسے انہوں نے اک نام دیا ہوا تھا،
''معذرت''
سقراط بولنا شروع ہوا۔
بولا،
''ایتھنز'' کے لوگو
عدالت میں کھلبلی سی مچ گئی۔
یہ ''ملزم'' عدالت کے ججوں اور جیوری کے بجائے، کن سے مخاطب ہو رہا ہے۔
ایتھنز کے لوگو،

مجھ سے پہلے، تم نے جن لوگوں کی طرف سے تقریریں سنیں، جو مجھ پہ الزام لگا رہے تھے تو میں خود یہ بھول گیا کہ میں کس طرح کا ''بندہ'' ہوں۔

انہوں نے سب کچھ کہا، سوائے ''سچ'' کے۔

ساری عمر صرف جسے کشید کرنے کی میں نے تمہیں تلقین کی۔

بادشاہ بھی اپنی جگہ پہ اونچی کرسی پہ بیٹھا تھا۔

وقت کا حساب رکھنے والوں نے پانی کی گھڑی چالو کر دی تھی۔

''سقراط'' آہستگی سے بڑے اعتماد سے بول رہا تھا جیسے اُس کے سامنے اُس کی زندگی اور موت کا فیصلہ کرنے والی جیوری نہیں، گلی محلے کے بچے ہوں۔

''سقراط'' بولا، مجھے میرے دشمن نہیں، یہ دنیا برباد کرے گی جو مجھے برا سمجھتی ہے، اسی ''دنیا'' نے نیک لوگوں کو برباد کیا ہے۔

آئندہ بھی یہ ''دنیا'' یونہی کرتی رہے گی۔ یہ قصہ مجھی پہ ختم نہیں ہونا۔

کچھ آوازیں اٹھیں، دیکھو۔

الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔

لوگوں میں شہد کی مکھیوں کی بھن بھن ہوئی۔ لوگوں کا شور کم ہوا تو ''سقراط'' کی آواز پھر گونجی۔

اگر تم سمجھتے ہو کہ ایک شخص، جو کسی قابل ہے، وہ یہی دیکھتے سوچتے زندگی گزار دے کہ اُس کے مرنے اور جینے کے امکانات کیا ہیں تو،

ہجوم نے پھر ایک گہرا سانس اندر لیا۔

''سقراط'' کی آواز آئی۔

تو۔۔۔ تم غلطی پہ ہو۔

کیا تمہارا خیال ہے ''ایکیلز'' موت کی پرواہ کرتا تھا؟ نہیں۔

''ایتھنز'' کے لوگو

سچائی کی روشنی میں دیکھو۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی کسی بات پہ قائم ہے تو کسی خطرے کو بھانپ کے اُسے اپنی بات سے ہٹنا جائز نہیں۔ اسے ڈٹا رہنا چاہیے۔

یہ پرواہ کرنا بے سود اور بے ذائقہ ہے کہ اُسے ''اپنی بات'' پہ ڈٹے رہنے سے کیا ملتا ہے۔

زندگی یا موت۔

''ایتھنز'' کے لوگو

میں اُسی مقام پہ کھڑا ہوں، جہاں مجھے کھڑا ہونے کا حکم ملا ہے۔ اگر میں کسی ڈر سے اس مقام سے ہل جاؤں تو یہ برا فعل ہوگا۔

''ایتھنز'' کے لوگو

سقراط کا بیان جاری تھا۔

جیوری والے سوچ رہے تھے کہ ''سقراط'' نے ملک کے دفاع کے لیے جوانی میں جو سرحدوں پہ ڈیوٹی دی تھی، اُس کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ وہ رحم کرتے۔

کیوں اپنے نسل در نسل شریف خانوادے کی بات نہ کی کہ جیوری والے رحم کرتے۔

وہ تو ''جیوری'' سے مخاطب ہی نہیں تھا۔

ایک رسم تھی کہ ''ملزم'' جیوری سے رحم کی اپیل کرتا مگر سقراط بولا،

سنو،

''ایتھنز'' کے لوگو

یہاں جیوری والوں نے قانون کے مطابق ''انصاف'' کرنے کا حلف اٹھایا ہے۔ رحم کرنا، ان لوگوں کے ''حلف'' کے خلاف ہے۔

میں ایسی کوئی ترغیب کا باعث نہیں بن سکتا۔

''ایتھنز'' کے لوگو

اگر مجھے اس شرط پہ معاف کر دیا جائے کہ آئندہ میں خاموش رہوں گا۔ تو میں اس شرط پہ رہائی سے انکار کر دوں گا۔

''ایتھنز'' کے لوگو

میں تمہارا دوست ہوں۔ تم سے محبت کرتا ہوں، اس کے باوجود میں تمہارا حکم نہیں مانوں گا۔ ایک آسمانی دیوتا کی اطاعت کروں گا، بجائے کئی کے۔

اور جب تک میری سانس چلتی ہے، ایک فلسفی کی زندگی بسر کروں گا۔ جو بھی مجھے ملے گا اُس کی ہمت افزائی کروں گا اور اُسے بتاؤں گا جو بات سچ ہے، حق ہے۔

میں سوال کروں گا۔

ٹٹولوں گا مخاطب کے باطن کو۔

اگر تم میں سے کوئی ''نیک'' ہونے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن حقیقت میں ''نیک'' نہیں ہے تو میں اُس کی ملامت کروں گا۔

میں اُسے کہوں گا کہ وہ بیش بہا چیزوں کو کم تر تصور کر رہا ہے اور جو بے قیمت ہیں بے حیثیت ہیں، انہیں اہمیت دے رہا ہے۔

ایتھنز کے لوگو

جو مرضی میرے ساتھ سلوک کرو۔

میرا طرز زندگی یہی رہا ہے۔

یہی رہے گا۔

سنو ایتھنز کے لوگو

یاد رکھنا۔

میں نہیں سمجھتا کہ برا آدمی، اچھے آدمی کو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ کہنے کو وہ اُسے قتل کر سکتا، جلاوطن کر سکتا۔ یہ کہہ کے سقراط مسکرایا اور بولا، اس سے اچھا آدمی نہیں مرتا، مارنے والے مر جاتے ہیں۔

سقراط نے ہنستے ہوئے لوگوں کو ایک پرانی کہانی سنائی۔

دیومالائی کہانی۔

کہا،

''ایتھنز'' ایک کاہل گھوڑے کی طرح ہے اور مجھے ایک مکھی بن کے اسے جگائے رکھنے کی ذمہ داری ملی ہے۔

ایتھنز کے لوگو،

اس بڑ مکھی سے ناراض نہ ہو۔

میں تمہیں جگانے آیا ہوں۔

سقراط نے بات جاری رکھی۔

''ایتھنز'' کے لوگو۔

میری دعا ہے کہ عدالت ایسا فیصلہ صادر کرے جس میں میری بھی بھلائی ہو اور اُن کی بھی۔ یہ کہہ کے سقراط ایکا ایکی اپنی بات کہہ کے بیٹھ گیا۔

شور پھر ہونے لگا۔
عدالت کی کارروائی ہوتی رہی۔
جیوری کی رائے شماری کے لیے مٹکے رکھ دیے گئے۔
مٹکے بھرے جانے لگے۔
نقیب اٹھ کے آ گیا۔
رائے شماری ہوگئی۔
نقیب نے ''سقراط'' کے کندھے کو اپنے عصا سے چھوا۔
معلوم ہوا ''سقراط'' مجرم قرار پایا۔
قانون کے مطابق ''سقراط'' کو فیصلہ سن کے کچھ بولنے کا حق حاصل تھا۔
لوگ سوچتے تھے کہ وہ ''سزائے موت'' کے بجائے کچھ اور مانگے گا، مگر ''سقراط'' بولا،
مجھے یہ امید نہیں تھی کہ ''پانچ سو ایک'' ارکان کے ہجوم میں صرف تیس کے فرق سے مجھے سزائے موت ملے گی۔
''ایتھنز'' کے لوگو
اگر میں اپنے شہر ''ایتھنز'' میں سچ نہیں بول سکتا تو پھر کسی دوسری جگہ کوئی مجھے کیوں سچ بولنے دے گا؟
ایتھنز کے لوگو۔
ہر روز اپنے آپ کو پرکھتے رہنا۔
اپنے آپ کو کھوج لگائے بغیر زندگی گزارنا بے معنی ہے۔
سقراط پھر مسکرایا، بولا،
''ایتھنز'' کے لوگو، یہ نہ سمجھنا کہ میرے پاس تمہیں متاثر کرنے والے چمکتے الفاظ نہیں۔
بہت ہیں۔ موت سے بچنے کے ہزار طریقے ہیں۔ موت سے بچنا کوئی مشکل کام نہیں۔
ناراستی سے بچنا مشکل ہوتا۔
سنو ''ایتھنز'' کے لوگو۔
نیک آدمی زندہ ہو یا مردہ۔
اسے بدی اور بدطینتی نہیں مار سکتی۔
آسمانی واحد دیوتا اُس کی طرف متوجہ رہتا۔
سقراط کی زندگی کا فیصلہ ہوگیا۔
مگر جاننے والے مانتے ہیں۔
اُسے مارنے والوں کو کوئی نہیں جانتا۔
تاریخ میں وہ زندہ ہے۔
''سقراط'' کے ہاتھ میں کوئی چیز مر نہیں سکتی تھی۔
موت بھی نہیں مری،
''پلوٹو'' سقراط کا امیر کبیر دوست شاگرد تھا۔
اُس پہ دل و جان سے نثار تھا۔
وہ ''سقراط'' سے ملنے آیا۔
بولا، اس جیل سے تمہیں نکال سکتا ہوں۔
جیل کے لوگوں کو رشوت دے کر ہر دروازہ کھلا سکتا ہوں،
سقراط، پلوٹو کے فرار کرانے کا منصوبہ سن کے مسکرایا۔
بولا، زندہ رہنا اتنا اہم نہیں جتنا صحیح انداز میں جینا۔
اور سنو، بدی کا جواب بدی نہیں ہوتا۔ سقراط کے پاس ''کرائیٹو'' اُس کا جان نثار تھا۔ پوچھنے لگا، ''سقراط'' ہم تمہیں کیسے دفن کریں؟
سقراط پھر مسکرایا، بولا، جیسے تم چاہو۔ مگر سنو،

سقراط نے ''کرائٹیو'' سے کہا۔ میرے جنازے پر یہ نہیں کہنا، کہ یہ سقراط کا جنازہ ہے۔
نہ،
جسے تم دفن کرو گے، وہ میرا جسم ہوگا۔
میری روح نہیں۔
سقراط کی بیوی اور بچے آ کے ملے۔
آخر میں ''جیلر'' آ گیا۔
رونے لگا، روتے ہوئے بولا،
وقت ہو گیا ہے۔
''سقراط'' مسکرا رہا تھا۔ بولا،
لاؤ، پیالہ۔
''سقراط'' نے اپنے دکھی دوستوں کو آخری نظر دیکھا اور پیالہ منہ سے لگا کے پی گیا۔
زہر پی کے حکم کے مطابق خاموشی سے سقراط نے کمرے میں چند قدم چلے، پھر کمبل اوڑھ کے بستر پہ لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد، اُس نے چہرے پہ پڑا کمبل ہاتھ سے ہٹایا اور اس دنیا میں آخری بات کی۔
بولا،
کرائٹو ہم پہ واجب کہ ایک مرغ آسانی دیوتا کے نام قربان کریں۔ کیا تم میری طرف سے یہ قربانی کرو گے؟ دیکھنا بھولنا مت۔
''کرائٹیو'' نے اگلے دن ایک مرغا قربان کر کے لوگوں کو کھلا دیا اور ''سقراط'' کا جسم دفن کر دیا۔
''سقراط'' نے ساری عمر جو کہا، وہ ''پلوٹو'' ساری عمر لکھتا رہا۔
''سقراط'' کا جسم مٹی ہو گیا۔
اُس کی کہی باتیں سونے میں ڈھل گئیں۔
امر ہو گئیں۔
وہ کہا کرتا تھا۔
جو خدا سے نہیں ڈرتا، وہ سب سے ڈرتا ہے
نیک آدمی کو زندگی میں یا موت کے بعد کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔
سقراط نے ''پلوٹو'' کو تلقین کی تھی کہ جو رستہ معلوم نہ ہو، اُس پہ سفر نہ کرو۔
اُس نے ''پلوٹو'' کو سمجھایا۔
برائی اور جھوٹ علم کی کمی کے سبب معرضِ وجود میں آتے۔
سقراط کہا کرتا تھا۔
ہر شخص کو اپنے ضمیر کی آواز پہ عمل کرنا چاہیے۔
سقراط کی ضروریات بہت کم تھیں۔ وہ کہا کرتا تھا، جن کی ضروریات کم ہوں، وہ خدا کے نزدیک ہوتا۔
سقراط لڑائی جھگڑے اور فساد سے دور بھاگتا تھا، کہتا تھا۔
عقل مند کی پہچان غصے کے وقت ہوتی۔
سقراط کی یہ بات کبھی نہیں بھولی جاتی،
تحریر ایک خاموش آواز ہے۔
اور قلم ہاتھ کی زبان
زبان سے باتیں کرتے کرتے ہم دونوں ایک انوکھے دور کے سفر پہ نکل گئے، جدھر پیالہ ایک تھا۔ ہم دو، بابا عرفان الحق اور میں۔

☆☆☆☆☆

اکلاپا

آج یونیورسٹی میں کتاب میلے کا آخری دن تھا- لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کیبن کچھ اکھڑ چکے تھے اور کچھ اکھاڑے جا چکے تھے- اسے مختلف کیفیتوں میں سے گزرنا اور ان کے فرق کو محسوس کرنے کا تجربہ ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا- آتا تو وہ روز تھا اور اپنی پسند کی کوئی نہ کوئی چیز روز خریدتا تھا- اب یہ لگنے سے اجڑنے تک کی کیفیت کو اپنے اندر محسوس کرنا چاہتا تھا- وہ کچھ دیر لان میں کھڑا پرندوں کو دیکھتا اور ان کی چہچہاہٹ سنتا رہا اور پھر چڑیاں لحہ بھر کو مختلف انداز میں چہچہانے لگیں جیسے خطرے کا الارم سن لیا ہو- اور ایک دم بھرا مار کر اڑ گئیں- اسی طرح کے حالات میں ماموں نے بتایا کہ چڑیوں میں شکرا آ گھستا ہے- تو وہ اسی طرح خوف کا الارم بجاتی ہوئی اڑ جاتی اپنی جان بچانے کے لئے- جان بچانے کے لئے مگر کس سے؟ اس نے پوچھا تھا- ''شکرے سے''- ماموں نے جواب دیا گوکہ شکرے چڑیا کے ہی جسامت اور وضع کے ہوتے ہیں مگر گوشت خور ہیں، کھا جاتے ہیں چڑیوں کو- بات دلچسپ مگر حیران کر دینے والی تھی کہ ایک جبلت کا فرق دنیا بدل دیتا ہے- وہ یہ دیکھتا اور سوچتا ہوا پھر ہال کے اندر چلا گیا جہاں کتاب میلے کے اہتمام میں چھوٹے چھوٹے لکڑی کے کیبن بنا دیئے گئے تھے اور انہیں رنگین روشنیوں اور خوبصورت چیزوں سے سجایا گیا تھا- اب میلہ اجڑ چکا تھا- اور بے دلی اور بے زاری چاروں طرف اپنے پھریرے اڑاتی پھر رہی تھی اور اسے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ ایک لڑکی کتابوں کا ڈھیر سامنے رکھے کباڑ میں سے مزید کتابیں چھانٹ رہی تھی- پوری بے فکری سے جیسے اس نے یہیں تو رہنا ہے- وہ خالی ہاتھ تھا، مڑنے لگا تو اس لڑکی نے کتابوں کو گنتے

فرحت پروین

گھنٹے اسے مخاطب کیا، کیا آپ واپس جا رہے ہیں؟'' جی''۔ اس نے مختصر جواب دیا۔ ''خالی ہاتھ ہی۔'' جی ہاں روز آتا رہا اور اپنی پسند کی کتابیں لے جاتا رہا۔ یہ واقعی میلہ تھا۔ کتابیں کافی رعایتی قیمتوں پر ملی ہیں۔ اس کا دھیان اس کا جواب سننے میں بالکل نہیں تھا۔ وہ پھر متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی بولی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یوں سب یکدم نکل جائیں گے۔ میں نے سوچا تھا کہ کیبن والے لڑکوں میں سے کسی سے مدد لے لوں گی، جو میری کتابیں گاڑی تک چھوڑ آئے گا۔ وہ اس کا مدعا سمجھتے ہوئے بولا؛ میں مدد کر دیتا ہوں۔ وہ کھل اٹھی۔ بس گیٹ تک لے جانی ہیں کتابیں باہر گاڑی کھڑی ہے۔ چلیئے، اس نے زیادہ کتابیں خود اٹھاتے ہوئے کہا۔ راستے میں دونوں ایک دوسرے کو بتاتے گئے کہ وہ کون کونسی کتابیں پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ لڑکے نے کہا کہ وہ اچھی بری ہر طرف کی کتابیں پڑھتا ہے۔ کہ اچھی اچھی کیوں ہے اور بری بری کیوں۔ لڑکی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ آپ اتنا وقت کہاں سے لاتے ہیں؟'' شوق دا کوئی مل نہیں۔'' اور دونوں اسی طرح باتیں کرتے ہوئے گیٹ تک پہنچ گئے۔ لڑکی نے گاڑی کھولی، دونوں نے کتابیں لادیں اور اس نے گاڑی کے دراز میں سے اپنا کارڈ نکال کر اسے دیا اور گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے بولی، کتابیں ایکسچینج کی جا سکتی ہیں۔

اور یہ جا وہ جا۔

بہت مختلف اور دلچسپ شخصیت تھی لڑکی کی اس نے اس سے اس کا نام تک نہ پوچھا تھا۔ دوسرے ہی دن اس نے خود کو اس کے دروازے پر پایا۔ اب ادھر سے گزر ہی رہا ہوں تو کیوں نہ اسے ملتا چلوں۔ اور پھر اسے خود اپنے جھوٹ پر ہنسی آگئی۔ مگر میں ادھر سے کیوں گزر رہا تھا۔ اس علاقے میں تو میں کسی کو نہیں جانتا تو وہ اتفاقاً ادھر کیسے آ نکلا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ اگر وہ اتنی خوبصورت اور دلچسپ نہ ہوتی تو ــــــ

اپنے اندر کی بحث سے اکتا کر اس نے گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ کئی منٹ گزر گئے کوئی نہ آیا تو وہ پلٹنے ہی والا تھا کہ ایک چھوٹے سے لڑکے نے دروازے کے اندر سے پوچھا!'' کون''۔ اس نے کارڈ بڑھایا اور لڑکا کارڈ لے کر اندر چلا گیا۔ تب اسے شیشے میں ایک خوفناک شکل والا آدمی دکھائی دیا۔ وہ پلٹنے ہی والا تھا کہ دروازہ کھل گیا، اور وہ دکھائی دیا جسکا عجیب سا نام اسے صحیح سے ادا کرنا نہیں آ رہا تھا۔

میں اتفاقاً ادھر سے گزر رہا تھا کہ سوچا آپ سے مل لوں۔ اگر آپ مصروف ہیں یا کوئی اور پروگرام ہے تو میں پھر چکر لگا لوں گا۔

ارے نہیں کمال ہے، آپ دروازے سے ہی لوٹ جائیں گے؟ تشریف لائیے۔ وہ آگے آگے چل دی اور یہ پیچھے پیچھے۔ گھر بڑا شاندار اور خوب سجا سجایا تھا وہ صحن میں

سے گزر کر patio کی طرف چلی اور بولی کہ میں لان ٹھیک کرا رہی تھی تو ادھر ہی بیٹھ جاتے ہیں، ان کو بھی دیکھتی رہوں گی۔ یہاں آپ کے ساتھ کون کون رہتا ہے؟ یہ سوال غیر ارادی طور پر اسکے منہ سے نکل تو گیا مگر وہ پشیمان سا ہو گیا کہ اسے اتنا ذاتی سوال کرنے کا حق نہیں ہے۔ مگر لگتا تھا کہ لڑکی نے مائنڈ نہیں کیا۔ میں اکیلی ہی رہتی ہوں - والدین کار ایکسیڈنٹ میں ایک ساتھ ہی گزر گئے۔ اب سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بات کو کیسے آگے بڑھایا جائے کہ یہ مشکل اس نے خود ہی آسان کر دی - کیسا خوبصورت موسم ہے، چائے پیتے ہیں۔ لڑکی کی خوش اخلاقی کے باوجود وہ اپنی وہاں موجودگی کا جواز نہ ڈھونڈ سکا۔ چائے آ گئی۔ ایک نو عمر لڑکی بڑے سلیقے سے چائے کی ٹرالی لے آئی۔ میں یہ کتاب پڑھ رہی تھی، بہت عجیب بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اس میں لکھا ہے کہ اگر آپ اکیلے رہتے ہیں تو کئی غیر مرئی چیزیں آپکی دوست بن جاتی ہیں۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اس کے دونوں پہلوؤں میں دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ یہ میں ہوں، اس نے بہت خوبصورت چھوٹی لڑکی کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اور یہ بھی میں ہوں اس نے جوان مگر خود سے کم عمر لڑکی کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ گڑبڑا گیا اور دوسرے ہی لمحے وہ دونوں لڑکیاں غائب تھیں اور یہ اس کے لئے چائے بنا رہی تھی۔

تب ہی اس نے دیکھا patio کے اندر ہی پھولوں کے پودوں کے ساتھ خوفناک شکل والا ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اب اس سے زیادہ دیر رکا نہ گیا اور اس نے کوئی مصروفیت یاد آنے کا عذر کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم کتابیں ایکسچینج کر سکتے ہیں، لڑکی خوش اخلاقی سے بولی۔ ''ضرور''۔ اس نے جواب دیا۔ تو اس گھر میں آپ کے علاوہ کوئی نہیں رہتا اور وہ فقط مسکرا دی۔ پھر لان میں سے گزرتے ہوئے کام کرتے ہوئے لوگوں کا دیکھ کر بولی، یہ سائے ہیں۔ اور چائے کی ٹرالی واپس لے جاتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر بولی یہ مشینیں ہیں۔ وہ بیرونی دروازے تک پہنچ چکی تھی کہ اسے پھر وہی کریہہ المنظر کرخت چہرے والا شخص دکھائی دیا۔ یہ کون ہے؟ اس نے جھجکتے جھجکتے پوچھ لیا۔ ''یہ'' وہ کھل کھلا کر ہنسی یہ تو اکلاپا ہے۔ اور یہ خود ہی ساتھ آ کر رہنے لگ جاتا ہے، چاہے آپ پسند کرو نہ کرو۔ اور جب وہ باہر نکلا تو اس عجیب و غریب جادوئی فضا سے سہما ہوا سا تھا۔ جب لڑکی نے دروازہ بند کیا تھا تب بھی اکلاپے کی کریہہ صورت اسے دکھائی دے رہی تھی۔ اور تب تک وہ لڑکی کی زیادہ تر باتیں سمجھ چکا تھا۔ اس کے پہلو میں چھوٹی لڑکی اور بڑی لڑکی، سائے اور اکلاپے ـــــــ اور اس کے اندر پھر اس ماحول میں آنے کی خواہش مر گئی۔

☆☆☆☆☆

سبت کے دن کا مقدمہ

یہ سبت کا دن تھا شہر کے تمام مرد عبادت گاہوں میں جمع تھے، گلیاں راستے اور بازار سب ویران تھے۔ وہ کہیں سے اچانک نمودار ہوگیا تھا۔ مکانوں اور دُکانوں سے بھری اتنی بڑی دُنیا کو خاموش دیکھ کر اُسکی آنکھیں حیرت اور خوشی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ بہت دیر تک گلیوں میں گھومنے کے بعد وہ ایک مکان کی دہلیز پر بیٹھ گیا۔ وہ لیٹ کر آرام کرنا چاہتا تھا۔ کہ مکان کا دروازہ کھلا ایک کمزور سے نسوانی ہاتھ نے اسکی طرف ایک چھوٹی طشتری بڑھا دی۔ جس میں ایک موسمی پھل اور روٹی پڑی ہوئی تھی ابھی اس کا کھانا ختم نہیں ہوا تھا کہ شہر کے تمام عبادت گاہوں سے لوگ اپنے اپنے گھروں کی طرف پلٹنے لگے۔ لوگوں نے سبت کے دن ایک شخص اور عبادت گاہ سے باہر دیکھا ان کے جذبات بھڑک اُٹھے۔ بہت سے جذباتی اس پہ جھپٹ پڑے اور اُسے گھسیٹتے ہوئے ٹھوکریں مارنے لگے۔ زمین پہ بل کھاتے ہوئے اچانک وہ اُٹھ بیٹھا وہ دھاڑا۔ تو لوگ سہم گئے۔ اپنے جسم کی تکلیف کے باوجود اُس نے دوڑ لگا دی۔ اور ایک عبادت گاہ کے کھلے دروازے کو دیکھ کر اس میں داخل ہوگیا۔ عبادت گاہ میں پیشوا شہر کے حاکم کے جاسوس اور امرا حاکم وقت کی طرف سے دیئے گئے تحفوں کو بانٹ رہے تھے۔ اُنہیں اس کی ہنگامہ خیز مداخلت پہ سخت غصہ آیا۔ پیشوا اُسے جھڑکتے ہوئے عبادت گاہ سے نکلنے کا حکم دے رہا تھا کہ مشتعل لوگوں کا ایک جتھا بھی اندر داخل ہوگیا۔ عبادت گاہ کے فرش رنگ پر برنگے تھیلے بکھرے ہوئے تھے چند لوگ اپنے غصے کو بھول کر بھرے ہوئے تھیلوں کی طرف لالچ اور تجسس سے دیکھنے لگے۔ پیشوا نے اُس شخص کی بابت سوال کیا۔ تو سب نے اُسے سبت کے دن کی توہین کا مجرم بتایا۔ پیشوا نے رعب اور غصے سے اس کے بال نوچتے ہوئے کہا۔ تو کون ہے؟ اور تجھے ہماری روحانی قدروں کی پامالی کا حوصلہ کیسے ہوگیا؟ اس نے اُسے گھونسے مارتے ہوئے عبادت گاہ کے صحن میں ایک تاریک کمرے میں بند کردیا اور پھر مشتعل

کلیم خارجی

جوانوں اور لوگوں سے کہا، جو شخص عبادت سبت کے دن پر ہمارے دیوتاؤں اور ہمارے عقیدوں اور رسموں سے بغاوت کر کے ان کی توہین کرے گا۔ اس کا انجام سب جانتے ہیں۔ آج چونکہ سبت کا دن ہے اور ہمارے دیوتاؤں کی پاکیزگی اور مسرت کا دن ہے۔ لہٰذا آج ہمیں اسے جلا کر اس کے ناپاک دھوئیں سے دیوتاؤں کا رنج نہیں لیں گے۔ کل کا سورج اس شخص کو راکھ ہوتا دیکھے گا۔ عبادت گاہ میں پہلے سے موجود شہر کے اہل کاروں اور پیشوا نے لوگوں کو عبادت گاہ سے پہلے تو نرمی اور شائستگی سے اور بعد میں غصے سے دھاڑتے ہوئے دفع ہو جانے کا حکم دیا۔ کیونکہ بہت سے لوگوں کے ہاتھ فرش پہ بکھرے ہوئے تھیلوں کی طرف بڑھنے لگے تھے۔

اگلے دن سورج کی تیز دھوپ چمکی تو پیشوا کے ملازم نے اُسے دھکیلتے ہوئے ایک کھلے میدان میں لے آئے۔ اس کے لیے آگ کا بندوبست کیا جانے لگا۔ لوگوں کا ہجوم تماشے کا منتظر تھا۔ بہت انتظار کے بعد حاکم وقت اپنے محافظ دستوں کے حصار میں شان سے چلتے ہوئے ہجوم کے درمیان آ کھڑا ہوا۔ اُس نے ہجوم سے سوال کیا؟ تم میں سے کوئی ہے جو اس ملعون کا عزیز ہو؟ ہجوم خاموش دیکھ کر وہ دوبارہ گرجا، کیا تم میں سے کوئی ہے جو اسے جانتا ہو؟ آخر یہ شخص اچانک کس طرح سے آیا ہے۔ اور کیوں یہ ہمارے بارے میں سب کچھ نہیں جانتا تھا، کیا یہ صرف ہمارے سبت کے دن کی بے حرمتی کے لیے ہماری زمین پہ وارد ہوا ہے میرا خیال ہے کہ ہمیں یہ کھوج لگانا چاہیے کہ یہ کون ہے؟ یہاں کس کے ہاں رہتا تھا۔ ممکن ہے یہ اسی شہر میں پیدا ہوا ہو۔ اور دشمنوں نے اُسے چھپا کر رکھا ہو۔ یہ ایک ادھیڑ عمر شخص ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سازش ہے کوئی بہت پرانی، اور گہری سازش ہے۔ یہ اسی شہر کے کسی گھر سے برآمد ہوا ہے اور اس کا تعلق یقیناً ان لوگوں سے ہوگا جنکی عبادت گاہیں اور دیوتا ہم نے برباد کر دیئے تھے۔ ہم اُس وقت تک اس کو زندہ رکھیں گے۔ جب تک اصل سازش تک نہ پہنچ سکیں۔ ہجوم کے اندر سرگوشیاں اُبھریں۔ حاکم اپنے جاسوسوں اور کارندوں کو کام پر لگا کر واپس چل دیا۔ چند دن بعد ایک چالاک اور مکار کارندہ اس عورت کے دروازے پہ جا پہنچا۔ جس نے سبت کے دن اپنی دہلیز پہ ٹیک لگائے بھوکے مسافر کو کھانا پیش کیا تھا۔

حاکم کو جب اس کامیابی کا پتہ چلا تو تکبر اور جوش سے اس نے فرمان جاری کیا کہ چونکہ عورت نہ صرف یہ کہ وہ سبت کے دن اور ان کے عظیم سنہری دیوتا کی اہانت کا باعث بنی ہے بلکہ اس نے ایک اکیلے اجنبی شخص کو کھانا دے کر اس کا حوصلہ بڑھایا جو اس شہر کے لوگوں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس لیے اس عورت کو چاہیے وہ جس عمر کی بھی ہو اور اس کا کسی سے بھی کوئی رشتہ ہو اسے بے نقاب کر کے ننگے سر اور ننگے پاؤں دربار میں

لایا جائے۔
حاکم کو یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ اس کے سپاہیوں کی حصار میں جب عورت کو دربار میں لایا جارہا تھا تو تماش بینوں کا ایک بڑا ہجوم بھی اس کے پیچھے ہولیا تھا۔
وہ ایک دبلی پتلی اور خوبصورت تھی اس کا رنگ جو کبھی بے حد سفید ہوا کرتا تھا اب زرد ہو چکا تھا۔ وہ اپنے خدوخال کی وجہ سے اپنے آس پاس کے لوگوں سے بہت مختلف تھی اس کے بال ابھی پوری طرح سفید نہیں ہوئے تھے۔
حاکم کچھ دیر اُسے حقارت اور طیش سے گھورتا رہا۔ پھر اس نے اپنے خادموں کو حکم دیا اسے ذرا میرے اور قریب لا کھڑا کردو۔
حاکم کے دونوں طرف اس کے معاونین اور خاص مشیر یوں کھڑے تھے جیسے وہ حکم ملتے ہی عورت کو نوچ ڈالیں گے۔ عورت کو قریب پا کر حاکم نے اس کے جسم کی گرمی محسوس کی لیکن ایک دم اس کی کمینی فطرت اُبھر کے اس لہجے میں اُتر آئی۔ اور وہ نتھنے پھلاتے ہوئے گرجا، اے بدبخت ملعون عورت تیری وجہ سے ہمارے عظیم دیوتا کی توہین ہوئی۔ ہمارا سبت کا دن ہماری پوجا اور ہمارے دیوتا کی عظمت میں اس کی سجدہ ریزی کا دن ہوتا ہے۔ ہمارے سارے مرد عبادت گاہوں میں ہوتے ہیں لیکن تمہاری وجہ سے ایک باغی اور مکروہ شخص عبادت گاہوں سے دور رہا۔ وہ سبت کے دن اور ہمارے شہر کے دیوتا کی عظمت کا منکر اور گستاخ بن کر گلیوں میں گھومتا پھرتا رہا
عورت حاکم کی بات سن کر دو قدم اور حاکم کے قریب ہو کر بولی۔ ''اے شہر کے حاکم مجھ پر اپنا قہر نازل کرنے سے پہلے اپنے ظرف اور جبر اور رحم کو سنبھال کے رکھ۔ میں اپنے جرم کے لیے معافی کی التجا نہیں کرتی۔ لیکن میری باتوں کی سچائی سن کر مجھے ہلاک کرنے کا فیصلہ کرنا۔ میں تیری فوج کے اس شہید کی بیوہ ہوں۔ جو تیرے دُشمنوں کے خلاف لڑتے ہوئے بیچ سمندر میں بحری جہاز میں جل کے راکھ ہوا۔ تو نے میرے دونوں بیٹوں کو ان کے باپ کی وفاداری اور شجاعت کے فیصلے سنا کر زبردستی اپنے سپاہیوں میں شامل کر رکھا ہے۔ میرا بڑا بیٹا تیرے بیٹوں کے محافظ دستے میں شامل ہے۔ اور تیرے دونوں بیٹے آج تک شکار گاہوں سے واپس نہیں لوٹے۔ اُنہوں نے کل سبت کے دن بھی شکار گاہوں میں گزارا۔ میرا چھوٹا بیٹا تیرے شمالی قلعے میں پہرہ داری پہ مامور اس نے تیرے کہنے پر اپنے سبت کا دن قلعے کی فصیل پر گشت کرتے گزارا ہے۔''
عورت کی گفتگو میں دلیری اور اعتماد دیکھ کر حاکم کے پہلو میں کھڑا مشیر غصے سے پھنکارتے ہوئے بولا، اے بدبخت اپنی حد میں رہ، تو نے ایک باغی کو سبت کے دن کھانا کیوں کھلایا۔

عورت مشیروں اور مصاحبوں کی پروا کیے بغیر حاکم پہ یوں نظریں جمائے کھڑی تھی جیسے اُسے پہچاننے کی کوشش کررہی ہو۔ حاکم کی خاموشی کو دیکھ کر اُس کے اندر کا اعتماد بڑھ گیا اور وہ اپنی چھاتیوں کو اپنی قمیض کی کالر میں چھپاتے ہوئے بولی۔

اے حاکمِ وقت تیرے شہر میں جب شہری دیوتا کی شبیہ کے لکڑی سے بنے ہوئے پانچ پانچ بالشت کے مجسمے تقسیم ہوئے تو تیرے بھیجے ہوئے پجاریوں اور پیشواؤں نے ہاتھیوں پہ بیٹھ کر ان مجسموں کی عبادت اور روحانی طاقتوں کے معجزے بیان کرتے ہوئے ہمیں وہ نیکیاں بھی بتائیں تھیں جو ان مجسموں کی خوشنودی کا اور ہمارے لیے برکتوں کا باعث بن سکتی ہیں۔ میں نے اور میرے آس پاس کے لوگوں نے یہی سیکھا تھا کہ اونچے اور پکے گھروں میں نہ رہو۔ اناج کو زمین پہ گرنے نہ دو۔ گھروں میں زیادہ دیر تک چولہے اور چراغ نہ جلاؤ۔ صحنوں میں پرندوں کے لیے پانی کے برتن رکھو اور سبت کے دن اپنے دسترخوانوں کو تازہ اور بھرا ہوا رکھو۔ بھوکے مسافروں اور محتاجوں کی بھوک مٹاؤ۔ اور صبح سورج کی کرن سے پہلے بادشاہ سلامت کے محفل کی جانب مجسمے کھڑے کرکے انہیں سجدے کرتے رہو۔ اور اپنے جسموں کو غذاؤں اور گناہوں سے بھاری اور پھیلا کر نہ رکھو۔ تمہاری باتوں سے تو لگتا ہے کہ تم ایک نیک عورت ہو۔ اور اس زمین کی اصلی بیٹی ہو۔

حاکم کے عقب میں ہاتھ باندھے ایک سفید ریش مشیر جذبات میں لرزتے ہوئے بولا۔

حاکم نے گھور کے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ اور پھر اپنی آنکھیں عورت کے چہرے پہ گاڑھتے ہوئے طعنہ زن ہوا لیکن ان سب باتوں کے باوجود تمہارا جرم کم نہیں ہو پاتا۔ آج سبت کا دوسرا دن ہے کل پہلا دن تھا ہم سبت کے دن موت کی سزائیں نہیں دیتے۔ تمہارے پاس جینے کے لیے وقت بہت ہی کم ہے۔ سچ بتاؤ تم اس لعنتی اور منحوس شخص سے کیا رشتہ رکھتی ہو۔

اے مشتعل و منتقم حاکم میں نے ہمیشہ کی طرح اپنے سامنے مجسمہ کھڑا کرکے اس کے پیروں میں وہ سب اناج اور پھل رکھ دیئے جو مجھے اس زمین پر میری زندگی میں اب تک مجھے قیمتاً ملتے آرہے ہیں۔ پھر میں نے دیوتا کے مجسمے کو سجدہ کرتے ہوئے وہ سب دُعائیں مانگیں جو میرے ماں باپ مانگتے مانگتے مرگئے۔ اور جو مجھے اس طرح یاد ہیں کہ اگر بھول جاؤں تو شاید جی بھی نہ پاؤں۔۔۔ وہ کھڑے کھڑے تھک گئی اس نے اپنے سانس پر قابو رکھتے ہوئے سخت زمین کی وجہ سے گھٹنوں میں اٹھنے والے درد کو برداشت کرکے سسکتے ہوئے کہا، اے حاکم سخت گیر و طاقت ور دُعائیں مانگنے کے بعد میں نے پھل اور روٹی کسی کو دینے کے لیے طشتری میں ہی رکھ دیئے۔ کیونکہ اپنے بیٹوں کی دُوری کی وجہ سے مجھے سبت کا کھانا اکیلے کھانا اچھا نہیں لگا۔ دروازے پہ قدموں کی آواز سن کر میں نے جھانکا تو مجھے

یوں لگا جیسے کوئی مسافر ہے یا میدان جنگ سے لوٹا ہوا تھکا ہوا کوئی سپاہی ہے۔ چنانچہ میں نے وہ طشتری اسکے حوالے کردی۔ یوں میں نے دیوتا ایک طرح اپنے دیوتا کو خوش کرنے کی کوشش کی۔

حاکم شہر اگر چہ ایک طاقتور آدمی تھا لیکن وہ بادشاہ وقت کا ماتحت بھی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بادشاہ کے جاسوس اس سارے معاملے کو پوری تفصیل کے ساتھ آگے بیان کریں گے اس کا غصہ اگر چہ کم ہو چکا تھا۔ اس کے دل میں عورت کے لیے ہمدردی اور احترام کے احساسات ابھرنے لگے تھے وہ خاموش کھڑے رہنے کے بعد اپنے پیشوا کی طرف مُڑا۔ تو پیشوا آگے بڑھتے ہوئے رُعب سے بولا کیوں نہ اس ملعون و گستاخ کی بات بھی سن لی جائے۔ حاکم نے مسکرا کر تائید کی۔ تھوڑی دیر بعد اس نڈھال اور بدہیئت آدمی کو عورت کے برابر کھڑا کر دیا گیا۔ لیکن نقاہت اور جسمانی چوٹوں کی وجہ سے وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ عورت نے اُسے ہمدردی سے دیکھ کر چیخ بلند کی۔ اور بڑبڑاتی، کمینے دیوتاؤں کی کمینگی کا شکار آزاد ہوا۔ دربار میں کھڑے کسی شخص نے اُسے اُٹھانے کی کوشش نہ کی۔ سب اس کے اُٹھنے کے انتظار میں تھے کہ پیشوا نفرت سے پھنکارا۔ اے عورت تُو نے منہ ہی منہ میں کچھ کہا ہے۔ جلدی بتا تو نے کیا کہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تیرا اس آدمی سے کوئی تعلق ضرور ہے۔

عورت رحم سے گرے ہوئے آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے پیشوا سے بولی۔ پیشوا جی بادشاہ وقت کی عبادت گاہ سنہری مجسمہ کے بارے میں سنا ہے کہ وہ پچیس بالشت لمبا، قد آور وجیہہ اور رعب دار ہے اُسے بادشاہ کے خاص لوگ سجدہ کرتے ہیں اور اس کی خوشنودی کا راز صرف بادشاہ اور اس کے قرابت داروں کو معلوم ہے۔ پھر ہم نے حاکم شہر کے مجسمے کے بارے میں سن رکھا ہے۔ کہ وہ بیس بالشت لمبا، وجیہہ اور شاندار ہے۔ لیکن ہم نے کبھی سونے کے ان دونوں مجسموں کو قریب سے دیکھا ہے نہ ہم آئندہ دیکھ پائیں گے۔ ہم کو ان مجسموں کے ہم شکل دیئے گئے ہیں۔ پانچ پانچ بالشتوں کے مجسمے جو صندل کی لکڑی سے بنے ہوئے ہیں وہ چھوٹے چھوٹے خوبصورت ہیں اور مجھ جیسے لوگوں کی زندگی اور گھروں میں صرف انہی مجسموں کی وجہ سے رونق اور خوشی قائم ہے۔ ہماری پوجا کے مجسمے چھوٹے چھوٹے ہیں لیکن وہ ہم سے بڑی بڑی قربانیاں مانگتے ہیں۔ اور بہت لمبی لمبی پوجا کے طلبگار رہتے ہیں۔

اس کے بعد عورت کی آواز بلند ہوگئی۔ اور اس کی زبان تیزی سے پھڑکنے لگی دربار میں کھڑے سب لوگ حیران و پریشان اُسے گھورنے لگے۔ کہ وہ کیا کہہ رہی ہے وہ کوئی غیر زبان بولے جا رہی تھی کہ دربار کے باہر

تماشائیوں کا ہجوم مشتعل ہو گیا۔
نعروں اور چیخوں کے طوفان سے دربار گونج اُٹھا حاکم وقت کے محافظوں نے مشکل سے انہیں قابو کیا تھا ایک جوان مرد چیختے ہوئے بولا۔ اے عظیم حاکم عبادت گاہ میں کھڑا مجسمہ اچانک زور سے زمین پر آ گرا۔ اور ماتھے سے لیکر گردن تک اس کے سر میں گہرا شگاف بن گیا۔ اس ملعون عورت اور غلیظ آدمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ دیوتا ہم سے ناراض ہو چکا ہے ہم نے سبت کے دنوں میں اس کی صحیح طریقے سے پوجا نہیں کی۔ ہم اس کے تقدس کو قائم نہیں رکھ پائے۔ اب ہم اس عورت اور مرد کی سوختہ قربانی کر کے ہی دیوتا کے قہر سے بچ پائیں گے۔ حاکم کے محافظوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو مشتعل افراد کو زبردستی دربار سے باہر نکال کر صورت حال کو سنبھالا گیا۔ لیکن باہر سے اُٹھنے والی آواز کی گونج دربار میں ایک خوف پیدا کیے ہوئے تھی۔ حاکم کے چند مشیر پیشوا کو لیکر عبادت گاہ کی طرف جا چکے تھے۔ حاکم اپنے دو مشیروں اور محافظ دستوں کے ساتھ دربار میں اکیلا کھڑا اس عورت اور مرد کو دیکھے جا رہا تھا کہ اچانک زمین پہ گرا ہوا آدمی سنبھلتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اور عورت سے مخاطب ہوا۔
اے مقدس و مہربان عورت یہ تیری زبان سے اچانک کون سا کلام ظاہر ہونے لگا تھا۔ عورت اُسے سنبھلتا ہوا دیکھ کر خوشی اور بے خوفی سے بولی میں نے کہا تھا کہ اگر دیوتاؤں کی اپنی کوئی مستقل مرضی اور خواہش نہیں تو ان پر لعنت، اگر ان کے احکام میں تضاد ہے تو لعنت۔ اگر وہ ہمیں نیکی کی ترغیب دے کر ہماری حفاظت نہیں کر سکتے تو ان کے پیچھے پھٹ جائیں۔ اور ان کے چہرے مسخ ہو جائیں۔ تا کہ ان کے سبت کے دن غارت ہو کر مٹ جائیں، عورت نے حاکم وقت اور اس کے چند مشیروں کی موجودگی کی بھی کوئی پرواہ نہ کی، حاکم وقت کا چہرہ اور لہجہ اچانک بدل گیا، اے بہادر عورت تو نے جو کیا دُرست کیا اصل میں ہم اپنے مجسمے اور معبود بنا کر ان کے اندر اپنی کمینگی، بے رحمی اور ذلت بھر دیتے ہیں۔ اور پھر تھوڑی تھوڑی نکال کر یہ ساری چیزیں اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ آؤ میں تمہیں عقبی دروازے سے گھوڑوں کے اصطبل کی طرف لے چلوں، تیز رفتار گھوڑوں پہ بیٹھ کر نکل بھاگو، وہ عورت اور اس آدمی کو اپنے پیچھے حیرت اور خوشی میں آتا دیکھ کر بے حد مطمئن ہونے لگا تھا اس کے محافظ سب سے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ وہ اصطبل کا بڑا دروازہ کھولنے ہی والا تھا کہ بادشاہ وقت کے جاسوس اور پیشوا نے اُنہیں جا لیا۔ پیشوا نے آگے بڑھ کر مرد کے بال اور عورت کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ پھر وہ اُنہیں کھینچتا ہوا ہجوم کی طرف نکل گیا۔ حاکم شہر اصطبل کے دروازے میں کھڑا خوبصورت سفید گھوڑے کو ہنہناتے ہوئے دیکھ کر آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتے جا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

اپنے اپنے زخم

مِشکا کون تھا؟

میں اُس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں اُس کے بارے میں بھلا جان بھی کیا سکتا ہوں۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں کہ اُس کی شکل و صورت کیسی تھی وہ کہاں رہتا تھا میری اُس سے کبھی ملاقات بھی نہیں ہوئی یوں تو بعض لوگ ملاقات کے بعد بھی اجنبی رہتے ہیں اور بعض گہرے تعلقات کے بعد بھی اجنبی نظر آتے ہیں۔

مگر آخر یہ مِشکا ہے کون؟

دنیا میں ہزاروں لاکھوں مِشکا پیدا ہوتے ہیں، مرجاتے ہیں اور اگر آج مِشکا موت کا کنواں کھودتے ہوئے خود موت کی وادی میں چلا گیا تو کونسی عجیب بات ہے اخبارات خبریں تو نت نئے ڈاکے چوری میں مرنے والوں کی خبر تو آتی رہتی ہیں اس خبر میں آخر کونسی بات ہے جو میں یوں سوچنے بیٹھ گیا ہوں۔ بس اتنی سی تو بات ہے نہ کہ وہ سرکس والوں کے لیے موت کا کنواں کھود رہا تھا جہاں موٹر سائیکل والا اپنے کرتب دکھا کر تماشائیوں کو محظوظ کرتا ہے تھکے ماندے ذہنوں کی تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا اُس کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی لوہے کی سلاخ اوپر جانے والے برقی تاروں سے چھو گئی موت نے اپنا کرتب دکھایا اور آناً فاناً میں اُس کا وجود خاک ہو گیا بس اتنی سی بات ہے نہ ___ مگر میں خیال آرائی تو کر سکتا ہوں کہ اُس کے دماغ پر کوئی بوجھ کوئی دُکھ اِس حادثہ کا موجب بنا کوئی تو ایسا سبب ہو گا۔ اُس کے ساتھ کام کرنے والوں نے جو اُسے بہت دِنوں سے جانتے تھے بتا رہے

اقبال خان یوسف زئی

تھے کہ وہ کافی دنوں کے بعد کام پر آیا تھا کھویا کھویا غمزدہ غمزدہ سا جیسے وہ خود آنا نہ چاہتا ہو جیسے پیٹ کا جبر اُسے گھسیٹتا ہوا لایا ہو۔ دیکھنے والوں نے یہ بھی بتایا کہ اُس کے ہاتھوں میں وہ پُھرتی چستی نہ تھی جو اُسے دوسروں سے الگ کرتی تھی کہ ٹھیکیدار اپنے کام کے لیے اُسے تلاش کر کے کام پر لگاتے تھے کام کے پہلے گھنٹے میں ٹھیکیدار کا سرکس والوں سے کوئی تنازعہ ہوا اور یہ جھگڑا اِسقدر بڑھا کہ ٹھیکیدار نے اپنے تمام مزدوروں کو بھی تھوڑی دیر کے لیے کام کرنے سے روک دیا اس دوران مشکا بھی سر نہوڑائے ایک طرف بیٹھا جانے کس گہری سوچ میں گم تھا۔ اُس کا دوست مٹھا نے مجھے کچھ باتیں بتائی تھیں کہ میرا یار خالی الذہن میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو جیسے ان آنسوؤں کو روک لینا چاہتا ہو جو اُس کے اندر طوفان بپا کر رہے تھے پھر جیسے اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے جن میں کوئی ربط نہ تھا وہ دور کہیں دور چلا گیا تھا قریب بیٹھے ہوئے لوگوں سے بے خبر اُس کی بڑبڑاہٹ تیز آواز میں بدل گئی سینہ کوبی کرتے ہوئے شاید وہ یہ کہہ رہا تھا۔ ابھی تو..... ابھی تو اُس کی آنکھوں میں گڑیوں سے کھیلنے کے خواب ہوں گے اپنی ماں کی بانہوں میں لوریاں سننے کی خواہش ہوگی باپ کی ٹانگوں سے لپٹ کر بازار سے ٹافیاں قلفی خریدنے کی ضد ہوگی۔ پہلی بار جب ایک اجنبی انسان نے..... نہیں، ایک درندے نے جس کی شکل انسان کی طرح تھی اُسے بالوں سے پکڑا ہوگا اُس کے سر میں پہلا سوراخ کرنے کے لیے بے حس اوزار اُٹھایا ہوگا اور اُس بچی نے جو میری اور تمھاری بچیوں جیسی معصوم بچی تھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ دوسرے لمحے اُس پر کیا قیامت گزرنے والی ہے پھر اُس کے بعد دوسرا تیسرا۔ چوتھا، پانچواں چھٹا، ساتواں سوراخ کرنے والے تجھ میں بے رحمی اور ظلم کے سینے میں سوراخ کر کے اُس کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی ہمت کیوں پیدا نہ ہوئی، جس نے تیری سوچ کو بے حس ڈرل مشین بنایا۔ تیرے ہاتھوں کو اِس قدر ہولناک کام پر اُکسایا، جس پر انسانیت کا سر شرم سے جھک گیا ہے۔

میں پوچھتا ہوں ___ اے کسی ماں کے لختِ جگر، کسی باپ کے نورِ نظر کیا دِل بیچ کر اُس

کی جگہ پتھر کا ٹکڑا رکھوالیا تھا بتا تو سہی یہ پتھر کتنے روپے کا تھا؟ دماغ میں دنیا کو جنت بنانے کا عزم نکال کر انسانیت کو جہنم بنانے کا سودا کتنے روپوں میں طے کیا تھا۔ مگر کہیں سے کوئی جواب نہیں آتا۔ بے حسی کی انتہا کو چھوتی ہوئی اِس ننگی حقیقت پر شاید وہ خوش ہیں کہ وہ اُن کی بچی نہیں تھی۔ ہائے میری گڑیا۔ میری بچی ڈرل مشین سے سر میں پہلا سوراخ، بے بسی اور کرب میں ڈوبی ہوئی پہلی چیخ۔ کیا کسی نے بھی نہیں سُنی؟ دونوں ہاتھوں سے ماتھا پیٹتے ہوئے اپنے سر کے بالوں کو مشکا نے نوچ ڈالا۔ ایک گہرا سناٹا، شاید ہوا بھی پتھر بن گئی تھی۔ اتنا کچھ جان کر۔ سوچتے سوچتے میرا ذہن بھی پتھر کا بن گیا ہے۔

مشکا تیرے محنتی ہاتھوں نے جب اُس صبح روٹی کا باسی ٹکڑا کالی چائے میں ڈبو کر یا مرچوں کی چٹنی کے ساتھ کھایا ہوگا تو کیا تجھے یقین تھا کہ اس کے بعد تُو کوئی لقمہ نہ اُٹھا سکے گا اور جب تیری بیوی نے دوپہر کے کھانے کے لیے روٹی کی پوٹلی دی ہوگی تو کیا تجھے علم تھا کہ تیرے ہاتھ اُسے کبھی نہ کھول سکیں گے اور جب تیری دوسری بیٹی میگھنا نے تیری ٹانگوں سے لپٹ کر کسی کھلونے کی فرمائش کی ہوگی تو کیا تُو جانتا تھا کہ اب کبھی اپنی بچی کے پیار کا لمس اپنی ٹانگوں پر محسوس نہ کر سکے گا اُسے ہمیشہ کی طرح کوئی کھلونا لا کر نہ دے سکے گا۔ تُو بھلا جان بھی کیسے سکتا تھا۔ یہ اربوں آدمیوں میں سے کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیسے مرے گا گو سب نے ایک دن مرجانا ہے۔۔۔ مگر کیا تجھے یہ احساس نہ تھا کہ ایک تیرے مرجانے سے پورا کنبہ مرجائے گا، تیری ماں۔ تیرا باپ۔ تیری بیٹی۔ تیری بیوی۔ زندگی کا یہ تانا بانا بنتے ہوئے۔ گھر واپس لوٹتے ہوئے، تیرے تھکے قدموں کو گھر جانے کے تصور سے بھی راحت ملتی ہوگی اور تیرے محنتی ہاتھوں کو بیوی کا ہاتھ تھامتے ہوئے جو سکون ملتا ہوگا وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔

تُو کوئی لیڈر نہ تھا کہ ملکوں ملکوں کے تعزیتی پیغام تیری بیوی کو ملتے۔ تُو تو۔۔۔ بس تُو تھا۔ ایک عام آدمی۔ اس حادثے کی خبر بھی اخبار میں چھپی۔ خبر کے آخر میں بتایا گیا کہ ''پولیس تفتیش میں مصروف ہے۔ مگر کوئی اس بار کی تفتیش نہیں کرے گا کے مشکا کی موت کے اسباب کیا تھے۔

☆☆☆☆☆

بہروپیا

پرندوں کے خاموش جھرمٹ، گندگی کے ڈھیر کے گرد منڈلاتے آوارہ گردکتوں کے بھونکنے کی کرخت آوازیں، آس پاس گھروں سے اٹھتے دھویں کے بھبھول، گلی کوچوں سے گھر واپس لوٹتے چند کھردرے ہاتھوں والے بکل مارے بچوں کے تھکے لٹکتے چہروں سے واضح ہو رہا تھا کہ شام کا وقت قریب تر ہے!!

ہائے یہ شام کی اذان ہو تو کچھ سکون ملے۔ سارے دن کی چخ چخ سے جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے۔ سکینہ چارپائی پر بچھی چادر کی سلوٹیں درست کرتی خود کلامی میں مصروف تھی۔ چولہے میں سوکھی لکڑیوں سے آگ جلاتی شبو روزانہ اپنی اماں کی اس خود کلامی کی عادی ہو چکی تھی جس کی وجہ سے آج بھی اس پر یہ باتیں اثر انداز نہیں ہو رہی تھیں۔ آگ آہستہ آہستہ لکڑیوں کو اپنی لپٹ میں لے رہی تھی اور شبو سوچ کے سفر پر روانہ خود کو انجام تک پہنچانے سے پہلے تدبیریں تلاش رہی تھی۔ پراندہ سنبھالے سانولے رنگ کی تیکھے نقوش والی شبو لکڑیاں اکٹھی کرتے ہوئے آس پاس سے بے خبر تھی کہ نہ جانے اسے لگا کہ پراندے پر کوئی چیز حرکت کر رہی ہے۔

اس کی نظریں سامنے ایک لمبے تڑنگے سایے پر پڑیں تو وہ اچھل کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کیا دیکھتی ہے کہ سامنے پگڑی باندھے حافظ سلیم شاطرانہ ہنسی سے اس کے قریب آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شبو نے لکڑیوں کا گٹھا چھوڑا، اس کے منہ پر طمانچہ مارتی، ہانپتی کانپتی گھر لوٹ آئی۔

اماں گوبر کے اپلے بناتی اسے دروازے سے اندر آتا دیکھ کر بولی، اے شبو پھوہڑ نکمی تجھے لکڑیاں اکٹھی کرنے بھیجا تھا تو سہیلیوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف ہوگئی۔ اماں، ماتھے سے پسینہ پونچھتے، وہ ہانپتے کانپتے بولنے ہی لگی تھی کہ اماں نوراں آگئیں، مبارکاں مبارکاں سکینہ سنا ہے تو عمرہ کرنے جا رہی ہے، کہتے ہوئے اس کے گلے لگ گئی۔ اس دوران شبو کمرے میں جا چکی تھی۔ اماں نوراں جا تو رہی ہوں لیکن شبو کے ابا بڑے پریشان ہیں۔

سکینہ پریشان ہوتے ہوئے کہنے لگی،

سعدیہ رحمان

ہیں ہیں ہیں، اس میں پریشانی والی کیا بات ہے۔ شکر کرو اللہ کا گھر دیکھنے جارہی ہو، خوش قسمت ہو، اماں نوراں اداکاری کرتے ہوئے سمجھانے لگی۔ اماں نوراں بات دراصل یہ ہے کہ اپنا حافظ سلیم ہے ناں مسجد کا امام مولوی کریم دا پتر، اس نے شبو کے لیے رشتہ مانگا ہے، تو شبو کے ابا کہہ رہے ہیں بڑا نیک بچہ ہے، حافظ قرآن ہے، پانچ وقت کا نمازی ہے۔ اس سے بہتر بھلا کون ہوسکتا ہے تو پہلے اس فرض سے آزاد ہوکر عمرے کے لیے جائیں گے۔ سکینہ راز سے اماں نوراں کو بتانے لگی۔ تو تیرے کہنے کا مطلب ہے کہ شبو کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں تو کیا شبو راضی ہے۔ اماں نوراں سمجھانے کے انداز میں معلومات لینے لگی۔ کمرے سے نکلتی شبو نے یہ الفاظ سنے تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی!

شبو کی ماں کہنے لگی، نا اماں نوراں شبو کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ سلیم کی نیک نامی کی مثال پورا گاؤں دیتا ہے۔ آج تک کسی چھوکری کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اب اپنی زرینہ کو دیکھ لو اس کی بیٹی صفیہ کے لیے بھی تو مولوی کریم نے رشتہ مانگا تھا۔ یہ تو قسمت کی بات ہے کہ وہ بے چاری شادی سے پہلے مرگئی تھی۔ سنا تھا خودکشی کی تھی لیکن زرینہ اب تک پچھتاتی ہے کہ کاش سلیم میرا داماد ہوتا سکینہ مارے خوشی کے پھولے نہیں سمارہی تھی کہ شبو کا ہونے والا شوہر حافظ سلیم ہے! شبو نے ساری رات اس پریشانی میں کاٹی کہ وہ ابا کو کیسے بتائے کہ اسے یہاں رشتہ نہیں کرنا۔

شبو پانی کا گھڑا اٹھائے کسی سوچ میں گم جارہی تھی کہ حافظ سلیم سفید کپڑوں میں ملبوس، پگڑی پہنے تسبیح لیے، شاطرانہ انداز سے یکدم سامنے آیا اور شبو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ گھڑا گرا اور چکنا چور ہوگیا اس کے خوابوں کی مانند!! لڑکھڑاتے قدموں سوجھی آنکھوں سے وہ پگڈنڈی پر چلتی آرہی تھی بار بار یہ الفاظ اسے زندہ درگور کررہے تھے۔ یہ اس دن کے طمانچے کا بدلہ ہے۔ ''اسے اب سمجھ آرہا تھا کہ صفیہ کی موت کیوں واقع ہوئی تھی۔ صفیہ کی موت کے دو سال بعد شبو خودکشی کی بھینٹ چڑھ گئی تھی یہ بتائے بغیر کہ سفید کپڑوں میں ملبوس ہاتھ میں تسبیح رکھنے والے پانچ وقت کا نمازی، حافظ سلیم وہ بہروپیا ہے جس نے دو، راج دلاریوں کو اپنی نیک نامی کی آگ میں زندہ جلا دیا ہے۔ اس بہروپیا کی نظر اب جوان ہوتی گل خانم پر ہے جو ایک معذور لنگڑے باپ کی بیٹی ہے۔ وہ بھی اب لکڑیاں لاتی ہے، پانی بھرتی ہے۔ گل خانم کو اس بہروپیے سے کون بچائے گا؟ کوئی ہے؟؟؟

☆☆☆☆☆

گرفت

بدلتا دن ایک قدم نئے امتحان کی طرف لے جا تا رہا تھا۔

پھر ماں باپ کا وہ خوشیوں بھرا آنگن وہ گڑیا وہ عید پہ نئی چوڑیاں، کپڑے اور پراندہ بالوں میں لٹکائے۔

خوبصورت سی یہ فرمائش صرف فرمائش رہ گئی پیچھے دفن ہوگئی وہاں ہی جہاں بچپن نے آنکھ کھولی اور رخصت ہوتے ہوئے سب یادیں خواہشیں ادھر تک ہی محدود رہ گئی۔

بانو ماں باپ کی اکلوتی شہزادی نازوں سے پلی خواہ اتنے امیر گھرانے سے تو نہیں تھی مگر ماں باپ نے نازوں سے ایسے پالا تھا کہ شہزادیوں سے کم نہ لگے۔

اس ڈر سے ماں باپ نے شادی بیاہ کا سوچا نہیں کے نہ جانے کیسے لوگ ملیں ہماری شہزادی کو ہماری طرح خوش رکھ سکیں گے کہ نہیں۔

اچھے رشتے کی جہاں تلاش رہی وہیں لوگ آئے دن آتے گھر جہیز کا دیکھتے اور انکار کر دیتے کہ چھوٹی سی جھونپڑی دو چار پائیاں اور چند برتن والے بھلا کیا دیں گے جہیز میں۔

ایک دفعہ بانو کے باپ نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے یہ سوچا کہ آخر کب تک رشتوں سے انکار کیا جائے گا اور لوگوں کو در پہ آتے جاتے دیکھا جائے۔

اپنی اور اپنی بیوی کی عمر دیکھتے ہوئے سوچ میں ڈوبتا چلا گیا کہ ہمارے بعد ہماری بیٹی کا کیا ہوگا آخر کوئی تو ملے جو ہماری بیٹی کا ہمارے جیسا خیال رکھ سکے ہمارے بعد اور ہر قدم اس کا ساتھ نبھائے۔

چند دنوں بعد ہمسائیوں کی عورت بانو کی ماں کے پاس آئی۔

سلام کرتے ہوئے دھیان نہ رہا اور دروازہ بند کرتے ہوئے پاؤں پہ لگ گیا تو وہ چلاتے ہوئے ہائے!!!! پیر میرا ہائے پیر میرا

بانو کی ماں بھاگتے ہوئے آئی اماں کو سلام کیا پوچھا آپ یہاں؟

اماں: ہاں بیٹا آتے ہی لگ گیا دروازہ۔

بانو کی ماں نے سہارا دیتے ہوئے چارپائی پہ بٹھایا، آپ آرام سے بیٹھیں یہاں۔

بانو کی ماں اس سے پوچھتے ہوئے اماں آپ نے آج یہاں ہمارے ہاں قدم رکھا سب خیر تو؟

اماں: ہاں بیٹا بتاتی ہوں پہلے پانی تو پلا دے ذرا۔

بانو کی ماں: ارے بٹیا پانی لا دو اور دودھ پتی بھی بنا دو اماں کے لیے۔

بانو: جی اماں ابھی لائی سر پہ ڈوپٹہ لیتے ہوئے سلام اماں یہ لیں پانی۔

اماں جی: یہ خدا کی دین مگر بس۔

محمد ارشاد انصاری

بانو کی ماں بس کیا کہیں؟ غریبی نہ دے اوپر والا کسی کو، بس جی کیا کہیں پریشان ہیں بیٹا کے لیے۔

اماں جی: اوہ میں بھول گئی رشتہ لائی ہوں بیٹا رانی کے لیے۔

بانو کی ماں پھولے نہ سماتے ہوئے بولیں بولیں کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ ہماری بیٹی کو خوش تو رکھے گا ناں؟

اماں جی: بولیں بس جہیز ذرا مونا ہونا چاہیے۔

بانو کے باپ کے کانوں تک آواز آئی، خیر سے آئی ہاں اماں جی سلام۔

اماں جی ارے بیٹا مہربانی۔

بانو کے ابا: یہ لے بیٹا سرسوں لے کے آیا ہوں پکالے۔

بانو ابا سے تھیلا پکڑتے ہوئے سلام ابا جی، جی ضرور۔

بانو کے ابا: آئی شاباش میری گڑیا کہتے ہوئے اماں جی کی طرف دیکھنے لگے، ہمارے کانوں تک جو آواز آئی ہے کیا سچ ہے کیا واقعی آپ رشتہ لائی ہیں؟

اماں جی بولیں ہاں بیٹا سچ ہے مگر۔۔۔

بانو کے باپ نے کہا آپ کا ہے کو فکر کرتی ہیں میں نے اپنی گڑیا کے لیے اتنی جمع پونجی کی ہے کہ وہ آرام سے لے جا سکے اور عزت سے رہ سکے زیور ہو یا ایک سوئی تک مگر لوگ اچھے ہوں بس۔

اماں جی: ہائے ہائے فکر نہ کر سنتے ہو جی لڑکا ولایت میں ہوتا ہے اس کو بس گھریلو لڑکی چاہیے کہو تو کل ہی لڑکے کے ماں باپ کو لے آؤں؟

بانو کے ماں باپ نے مطمئن ہوتے ہو سر ہلایا کہ ضرور۔

وہاں بانو دروازے کے پیچھے چھپی چھپی شرمائی اور کھو گئی خیالوں میں کہ آ گیا شہزادہ ولائتی جو مجھے اڑا لے جائے گا گجرے بھی دلوائے گا۔

اگلی صبح دستک ہوئی تو بانو کے اماں ابا برآمدے میں ہی بیٹھے ہوئے تھے بانو کے ابا نے دروازہ کھولا اور مہمانوں کو اندر آنے کا بولا۔

بانو کے ابا: آئیں آئیں اماں جی۔۔

اماں جی: احتراماً کہنے لگی آؤ آؤ جی تسی اپنا ہی گھر سمجھو بس بانو کے اماں ابا نے مہمانوں کو بیٹھنے کا کہا ماں لال جوڑا پہنے ہاتھوں میں چوڑیاں پہنے ناک چنکائے بولی

ہاں جی ہمارا بیٹا تو بس کیا بتائیں ولایت جا کے بھی اپنی روایات نہیں بھولا اچھا خاصا کما لیتا ہے۔

لڑکے کا باپ: ارے چیکو کی ماں بتا ناں کہ اس نے وہاں ایک سائیکل بھی رکھی ہے وہاں ولایت میں اور کما بھی اچھا لیتا ہے۔

سر ہلاتے ہوئے لڑکے کی ماں بولی: ارے باسط کے ابا ہمارا بیٹا اب بڑا ہو گیا ہے اس کے لیے رشتہ لے کے آئے ہیں یہاں بھی چیکو اور دونوں ہنسنے لگے باسط کے ابا بانو کے والدین کی طرف دیکھ کر بولے کیا کریں باسط جتنا بھی بڑا ہو جائے آخر ہمارے لیے تو چھوٹا ہی ہے ناں۔

بانو کے ابا سر ہلا کے بولے ہاں ہاں ہر ماں باپ کے لیے اپنا بچہ شہزادہ ہی ہوتا ہے۔

باسط کی اماں نے بانو کی اماں کو دیکھتے

ہوئے کہا جی بتایئے ناں ہمیں بیٹیا
اماں جی نے تو بانو کے لیے تعریفوں کے پل باندھ رکھے ہوئے۔
ہم بھی تو دیکھیں کیسی ہے پری؟
بانو کی اماں گھبرائی اور مسکراتے ہوئے بولی
جی جی ہماری بانو تو رانی ہے ابھی بلوائے دیتی ہوں۔
بانو کی ماں بانو کی طرف کمرے میں گئی اور چائے کا تھال ہاتھ میں تھمائے بولی بانو بیٹی اچھے کھاتے پیتے گھرانے کے ہیں خوش رہے گی تو
بانو شرماتے ہوئے بولی جی ماں جی۔
اور بانو اپنی ماں کے ساتھ چل پڑی اور باسط کے اماں ابا کو سلام کر کے چائے کا کپ پکڑانے لگی۔
لڑکے کی ماں بانو کو خاموشی سے دیکھنے لگی جیسے حواس گم گئے اس کے۔
بانو کے اماں ابا پریشان کے آخر کیوں نہیں بول رہی اس کی ماں اور بولے لیں ناں جی چائے بسکٹ۔
باسط کی ماں جی جی لے رہی ہوں آپ کی بیٹی کی تو کیا ہی بات ہے۔
بانو شرماتے ہوئے کمرے کی طرف جانے لگی تو بانو کے والدین نے کہا کہ جی بچی ہے شرما گئی،
باسط کے اماں ابا آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے تو اماں جی بولی تو کیا طے پایا جی؟؟
تو لڑکے والوں نے کہا کہ بس جی آپ طے کر لو تاریخ اگلے ہفتے کی کہ ہمارا بیٹا آرہا ہے اور رخصتی کی کوئی تاریخ بتا دو کہ ہم جلد رخصتی کر لیں اور کاغذات بنوالیں بانو کے تاکہ ہمارے بیٹے کے ساتھ ہی روانہ ہو جائے۔
بانو کے والدین تو ایسے مسکرائے جیسے اوپر والے نے ان کی سن لی ہو کہ بیٹی خوش رہے جہاں رہے ہمیشہ۔
بانو کے والدین بولے جی شکریہ آپ فکر نہ کریں ہم بس بیٹی کی رضامندی جان کر کل ہی آپکو جواب بھجوا دیں گے۔
باسط کے والدین نے رخصتی چاہی اور اماں بولی بس جی اب میری مٹھائی کا بندوبست کریں۔
دونوں گھرانو سے یک زبان آواز آئی ہاں جی بلکل بلکل۔۔۔
بانو کے گھر تو جیسے عید کا سماں تھا بانو کا باپ بھاگ کر مٹھائی لایا اور بانو کی ماں بیٹی کے سر پہ ڈوپٹہ اوڑھے گنگنانے لگی
کہ "بیٹیا بنے گی دلہنیا رانی"
اگلے دن لڑکے والوں کے پوچھنے پر بانو کے گھر والوں نے رضامندی کا اظہار کر دیا اور دونوں گھرانوں میں شہنائیاں بجنے لگی۔
بانو کے والدین نے کوئی کسر نہ چھوڑی گھر کا سامان ہو یا شادی کا خوب دھوم دھام سے دوگ کیا۔
دن گزرتے اتار چڑھاؤ آنے لگے۔
بانو کی ساس کبھی اسے طعنے دے تو کبھی سر پہ بٹھائے اپنے کام نکلوانے کے لیے دو میٹھی باتیں کر دے

بانو جب بھی اپنے گھر آئے چہرے پہ ہنسی اور دل میں غم چھپائے
ہزار، ماں باپ پوچھ لیں تو کچھ نہ بتائے۔
بانو پانی پینے بیٹھی تھی کہ ابا نے پوچھا کہ بانو بیٹی کب بلائے گا تجھے داماد؟
بانو بولی کچھ پتہ نہیں ابا جان
ابا بولے میں پوچھوں گا آج جب تمھیں چھوڑنے جاؤں گا تو۔
بانو سر ہلانے لگی، اپنا سامان اٹھایا اور ابا کے ساتھ چل پڑی۔
باسط کے گھر پہنچے تو اس کے باپ نے اندر آنے کو کہا بانو کے باپ کو، دونوں میں گفتگو ہوئی تو بانو کے ابا بولے کب جا رہی ہے بٹیا داماد کے پاس؟
باسط کے ابا بولے ابھی چند دن ہیں بس۔
شادی کے ایک ماہ بعد بانو باسط کے پاس چلی گئی، باسط کا رویہ بانو کے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں تھا، بیوی کو مارتا یا کسی ناں کسی بات پہ اسے طعنے دیتا۔
بانو کو جو دال روٹی ملتی اس پہ صبر کر لیتی۔
دن گزرنے کے ساتھ ساتھ باسط کے راز کھلنے لگے کہ اس کی کوئی اچھی نوکری نہیں یہاں بلکہ یہاں وہاں بیٹھ گیا کچھ ملا تو لے آیا ورنہ بھوکا سو گیا اور بانو کو بھی بھوکا سلا دیا۔
بانو صبر سے سب کچھ دیکھتی رہی کہ اتنے میں بانو کے ہاں خوشی کی خبر آئی۔
بانو نے اس لیے بھی صبر کر رکھا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ اولاد ہو جانے کے بعد باسط اپنی ذمہ داریوں کو سمجھ پائے۔
مگر بدقسمتی سے اولاد کی پیدائش بھی اسے نہ بدل سکی آئے دن وہی مار پیٹ وہی سب کچھ۔
بانو جتنا زیور ساتھ لائی تھی وہ سب لے کر بیچ کر نشہ کرتا رہتا۔
بانو کی ہمت جواب دے رہی تھی مگر وہ اس لیے خاموش تھی کہ والدین کو دکھ نہ دے اس ڈر سے واپس نہیں جا رہی تھی۔
ایک دن بانو کی نند نے اسے آ کر سمجھایا کہ میں خود اس اذیت سے گزر رہی ہوں مگر میرا بھائی آج رات تمھیں مار دے گا وہ آئے تو تم اس سے طلاق کے کاغذات میں دستخط کروا لینا اور ہم تمھاری ٹکٹ کروا دیں گے اور تم یہ بچہ یہاں دے کے چلی جانا اپنے اماں ابا کے پاس پاکستان۔
بانو نے خوب خود کو سمجھایا مگر اذیت کم ہونے کا نام ہی نا لیتی بانو نے اپنی اولاد نہ چھوڑنے کے لیے بھی رونا دھونا منتیں کیں مگر کچھ کام نہ آیا۔
بانو کی نند نے کہا تم اس وقت موقع کی نزاکت کو سمجھو اور جان کو بچاتے ہوئے خود نکل جاؤ ورنہ تمھارے اماں ابا کو تمھیں دیکھتے ہوئے بہت اذیت ہو گی۔
بانو بولی: اولاد کو چھوڑ کے جانا میرے لیے جیسے ہر چیز سے باغی ہونا ہے مشکل ہے میرے لیے یہ گھڑی بھلا اپنی اولاد کو کوئی چھوڑ کیسے سکتا ہے

بانو کی نند نے ہاتھ تھاما اور حوصلہ دیتے ہوئے کاغذات تھمائے اور کہا کہ اس سے اچھا موقع نہیں ملے گا۔
شوہر کو نشے کی حالت میں پایا بانو نے ہمت کر کے اپنے شوہر سے دستخط کروائے اور اس نے بھی نشے کی حالت میں دستخط کر دیے۔
بانو نے کاغذات تھامے اور نکل پڑی راستہ جیسے اسے کھاتا رہا ایک طرف ماں باپ کا غم دوسری طرف طلاق کا اور تیسرا اولاد کا۔
حالات سب اس کے سینے میں جیسے زہر بن کے اتر رہے تھے۔
بانو پاکستان پہنچی جب گھر آئی تو تالا لگا ملا پوچھنے پہ معلوم ہوا کہ ابا کا انتقال ہو گیا ہے اور اماں ہسپتال میں زیرِ علاج ہے اور طبیعت ناساز ہے۔
بانو کی ہمت ٹوٹ گئی وہ چیختے چلاتے اماں کو دیکھنے ہسپتال کو دوڑی۔
بانو ماں کے پاس پہنچی ہی تھی کہ نرس نے اس کی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دیا پاس بیٹھی بانو کی پھوپھو رونے لگی بانو نے جب یہ منظر دیکھا تو اس کے ہوش و حواس اڑ گئے۔
بس شکوہ کرنے لگی کہ اے خدا ایسا کیوں جب شادی راس نہ تھی تو نہ ہوتی نہ یہ سب ہوتا نہ میرے ماں باپ مرتے ایسا کیوں کیا میرے ساتھ؟
بانو کی پھوپھو نے اسے تھپکی دی اور کہا ہوش میں آ بیٹا ہوش میں آ۔ تیرا باپ بہت پوچھتا تیرا اگر بیٹا تیری بدقسمتی تو نا تھی۔
بانو پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی اور کہنے لگی اے ماں اے ابا اچھا ہے کہ تم دونوں میرے غم دیکھنے سے پہلے چلے گئے کم از کم جاتے جاتے میری پل بھر کی خوشی تو دیکھ لی۔
اے اماں اے اماں ایسے میں بانو بے ہوش ہو گئی۔
تدفین کی رسم کے بعد کچھ عرصہ گزرا جس میں بانو نے خود کو سنبھال لیا اور اس کے پاس جو ہنر تھا کپڑے سینے کا اس کو اپنی روزی روٹی کا ذریعہ بنا لیا۔
اور وہ ایک محلے کی مشہور درزن کہلانے لگی۔
وہاں باسط جس کو احساس ہوتے ہوتے بہت دیر ہو گئی تھی تب تک اسے کئی امراض نے گھیر لیا تھا۔
سرطان کا مرض اور دل کے مرض نے اسے جکڑ لیا تھا۔
وہ جان چکا تھا کہ اسے اس کے گناہوں کی سزا ملی ہے جو وہ کسی کی بیٹی کو دھتکارتا رہا اور ساتھ ہی جوا اور غلط کام جو کرنے کے نا تھے۔
وہ روتا اور سوچتا کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے وہ سزا دینے پہ آئے تو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی سزا دے سکتا اور اس سے کوئی پوچھ بھی نہیں سکتا۔
اس لیے جب کسی کو دکھ دو تو سوچ سمجھ کے دو کہ کہیں وہ لوٹ کر نا آ جائے اور بے شک وہ لوٹ کے آئیں گے یہی اصول دنیا کا۔
اس کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو تھے اور آخری سانسیں۔

☆☆☆☆☆

دنیا کی آخری رات

''تم کیا کرتی اگر تمہیں معلوم ہوتا کہ یہ دنیا کی آخری رات ہے؟''

''میں کیا کرتی؟ تمہارا مطلب ہے۔ سچ میں۔''

''ہاں، میں سنجیدہ ہوں۔''

''میں نہیں جانتی، میں نے کبھی سوچا نہیں۔'' اس نے چاندی کے کافی دان کا ہینڈل اس کی جانب موڑتے ہوئے کہا اور دو پیالے میز پوش پر رکھ دیئے۔

اس نے کافی ڈالی۔ اس کے پیچھے اطاق کے ایک چھوٹے قالین کے ٹکڑے پر سبز لالٹین کی روشنی میں دو ننھی بچیاں بلاکز کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ شام کی ہوا میں کافی کی خوش کن اور دل آویز مہک شامل ہوگئی تھی۔

''اچھا ہے کہ اس کے بارے میں سوچنا شروع کردو۔'' اس نے کہا۔

''تمہیں اس سے کچھ لینا دینا نہیں۔'' اس کی بیوی نے کہا۔ اس نے سر ہلایا۔

''ایک جنگ۔۔'' اس نے اپنے سر کو جنبش دی۔

''ہائیڈروجن یا ایٹم بم بھی نہیں؟''

''نہیں''

''یا کہ جراثیم کش جنگ۔۔۔''

''ان میں سے کچھ بھی نہیں۔۔'' اس نے آہستگی سے اپنی کافی کا لطف لیتے اور اس کی کالی تہہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

''چلو یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی کتاب کو بند کرنا۔''

''میں سوچتی نہیں، سمجھتی ہوں''

''نہیں اور حقیقتاً میں بھی نہیں - یہ صرف احساس ہے جو مجھے خوف میں مبتلا کر دیتا ہے اور کبھی کبھار میں بالکل بھی خوفزدہ نہیں ہوتا بلکہ بہت پرسکون۔۔۔'' اس نے لڑکیوں پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی تو لالٹین کی زرد روشنی میں ان کے سنہرے بال چمک رہے تھے، اس نے اپنی آواز آہستہ کی اور بولا، ''میں نے تمہیں کچھ بھی نہیں بتایا پہلی بار یہ چار راتیں پہلے ہوا تھا۔''

''کیا؟''

''ایک خواب۔۔ میں نے خواب دیکھا کہ

مترجم: حمزہ حسن شیخ

سب کچھ ختم ہونے والا ہے اور ایک آواز نے کہا بھی کہ یہ ہو چکا لیکن اب مجھے وہ آواز یاد نہیں۔ لیکن ایک آواز تھی ضرور اور اس نے کہا تھا کہ یہاں زمین پر سب چیزیں ختم جائیں گی۔ میں نے اس کے بارے میں زیادہ نہیں سوچا۔ جب میں دوسری صبح جاگا تو میں کام پر چلا گیا لیکن یہ احساس سارا دن میرے ساتھ رہا۔ میں نے Stan Millis کو دیکھا جو سہ پہر کے درمیانی وقت میں کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ میں نے اسے کہا۔ ''تمہارے خیالات کو سلام ہے، Stan'' اس نے کہا۔ ''میں نے پچھلی رات ایک خواب دیکھا ہے۔'' اور پھر اس نے مجھے اپنا خواب سنایا بھی۔ میں جان گیا کہ یہ کیا تھا؟ میں نے اسے بتایا ہوتا لیکن اس نے مجھے سنایا اور میں نے اسے سنا۔''

''کیا یہ ویسا ہی خواب تھا؟''

''ہاں، میں نے Stan کو بتایا کہ میں نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا تھا۔ اسے حیرت نہ ہوئی۔ درحقیقت وہ پرسکون تھا۔ پھر ہم نے اس کو جاننے کے لیے آفس میں چہل قدمی جاری رکھی۔ یہ کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہ تھا۔ ہم نے نہیں کہا کہ آؤ ٹہلیں۔ ہم نے اپنی جانب سے چلنا جاری رکھا اور ہر جگہ ہم نے دیکھا کہ لوگ اپنے اپنے ڈیسکوں کو غور سے دیکھ رہے تھے یا اپنے ہاتھوں کو یا کہ کھڑکیوں سے باہر۔ وہ اس کو دیکھ ہی نہیں رہے تھے جو کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ ان میں سے کچھ سے میں نے بات کی اور کچھ سے Stan نے۔''

''اور ان سب نے بھی خواب دیکھا تھا کیا؟''

''ہاں ان سب نے بھی۔ ایک جیسا خواب، جس میں کوئی فرق نہیں۔''

''کیا تم خوابوں پر یقین رکھتے ہو؟''

''ہاں، لیکن میں اس کے بارے میں زیادہ اعتقاد نہیں رکھتا۔''

''اور یہ کب ختم ہو گا؟ میرا مطلب ہے دنیا—''

''کبھی ہمارے لئے رات کے دوران اور پھر جیسے ہی رات دنیا کے اور گرد گھومتی ہے— وہ گردش کرتے حصے بھی اسی کے ساتھ جاتے ہیں۔ اس تمام کو مکمل ہونے میں کوئی چوبیس گھنٹے ہی لگیں گے—''

وہ بغیر اپنے کافی کے پیالوں کو چھوئے کچھ دیر کے لئے بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے آہستگی سے اس کو اٹھایا اور ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے پیا۔

''کیا ہم یہ حق رکھتے ہیں؟'' اس نے کہا۔

''یہ حق رکھنے یا نہ رکھنے کا معاملہ نہیں ہے، یہ صرف وہ چیزیں ہیں جو کام نہیں کرتیں۔

میں نے نوٹ کیا ہے کہ تم ان کے متعلق بات تک نہیں کرتی۔ آخر کیوں؟''

''مجھے اندازہ ہے کہ اس کی ایک وجہ ہے۔'' اس نے کہا۔

''ویسی ہی وجہ جیسی کہ دفتر میں ہر بندے کو ہوتی تھی۔۔۔؟''

اس نے سر نفی میں ہلایا، ''میں کچھ بھی نہیں کہنا چاہتی۔ یہ پچھلی رات کو ہوا ہے اور دوسرے بلاکز کی عورتیں بھی اس کے متعلق باتیں کر رہی تھیں، صرف ایک دوسرے کے ساتھ۔۔۔'' اس نے شام کا اخبار اٹھایا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''خبروں میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں ہے۔''

''نہیں، ہر ایک جانتا ہے، تو اس کی کیا ضرورت ہے؟'' اس نے اخبار لے لیا اور پہلے لڑکیوں کی طرف اور پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی کرسی کے ساتھ ٹیک لگالی۔

''کیا تم خوفزدہ ہو؟''

نہیں، بلکہ بچوں کے لئے بھی نہیں۔ میں نے ہمیشہ سوچا کہ میں موت سے خوفزدہ ہو جاؤں گا لیکن نہیں۔''

''وہ خود دفاعی کا احساس کہاں ہے جس کے متعلق سائنس دان بہت باتیں کرتے ہیں؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ تم کو اتنا پرجوش نہیں ہونا چاہیے جب تمہیں معلوم ہو کہ چیزیں منطقی ہیں۔ یہ منطقی ہیں۔ کچھ بھی تو نہیں لیکن یہ سب کچھ ویسے ہی ہو سکتا تھا جیسے کہ ہم رہتے ہیں۔''

''ہم اتنے برے بھی تو نہیں رہے۔ کیا ہم رہے؟''

''نہیں اور اتنے زیادہ اچھے بھی نہیں۔ میں اس کو ایک مشکل تصور کرتا ہوں۔ ہم اپنے علاوہ کچھ بھی اتنے خاص نہیں ہیں جبکہ دنیا کا ایک بڑا حصہ اس طرح کی عجیب و غریب چیزوں میں مصروف ہے۔''

لڑکیاں اپنے اطاق میں ہنس رہی تھیں جیسے انہوں نے ان کی جانب ہاتھ ہلائے اور ان کے بلاکز کا گھر نیچے گر گیا۔

''میں نے ہمیشہ یہ تصور کیا کہ لوگ گلیوں میں چیخ رہے ہوں گے جب بھی اس طرح کا وقت ہوگا۔''

''میرا اندازہ ہے کہ نہیں۔ تم حقیقی چیزوں کے بارے میں کراہتے ہو۔۔۔''

''کیا تم جانتی ہو۔ میں کسی چیز کو نہیں کھو سکوں گا سوائے تمہارے اور ان لڑکیوں کے۔ میں نے کبھی بھی شہروں، آٹوز، فیکٹریوں، اپنے کام یا کسی اور چیز کو اتنا پسند نہیں کیا سوائے تم تینوں کے۔۔۔ میں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں کروں گا سوائے اپنے خاندان کے اور شاید موسمی حالات کی تبدیلی کو یا ٹھنڈے پانی کے اک گلاس کی جو گرم موسم میں ضروری ہوتا ہے یا

آرام کے۔ حقیقت میں یہ سب بہت چھوٹی چیزیں ہیں۔ ہم یہاں پر کس طرح بیٹھ سکتے ہیں اور اس طرح بات کر سکتے ہیں۔"

"کیونکہ کرنے کے لئے اور کچھ نہیں۔"

"یقیناً یہی بات ہے۔ اگر وہاں پر کچھ ہوتا تو ہم کر رہے ہوتے۔ میں تصور کرتا ہوں کہ دنیا کی تاریخ میں یہ پہلی دفعہ ہوا ہے کہ ہر ایک نے صرف یہ جانا کہ پچھلی رات کے دوران وہ کیا کرنے جا رہے تھے۔"

"میں حیران ہوں باقی سب لوگ اب کیا کریں گے، اس شام کو یا آنے والے کچھ گھنٹوں میں"

"شو میں جائیں، ریڈیو سنیں، ٹی وی دیکھیں، تاش کھیلیں، بچوں کو بستر پر سلا دیں خود بھی بستر پر سو جائیں جیسے کہ ہمیشہ ہوتا ہے۔"

"جس طرح کسی چیز پر فخر کیا جاتا ہے۔۔۔ جیسے کہ ہمیشہ کیا جاتا ہے۔"

"ہم سارے برے نہیں ہیں"

وہ ایک لمحے کے لئے بیٹھ گئے اور پھر اس نے کچھ اور کافی ڈالی۔

"تم ایسا تصور کیوں کرتے ہو کہ یہ آج کی رات ہی ہے؟"

"کیونکہ۔۔۔"

"کیوں نہیں، پچھلی صدی کی دس سالوں کی کوئی رات یا پانچ صدیاں پہلے کی یا دس۔۔۔؟"

"شاید یہ ہو کیونکہ 30 فروری 1951 کبھی بھی نہیں آیا، اور نہ کبھی پہلے کی تاریخ میں لیکن اب یہ ہے اور یہی بات ہے کہ اس تاریخ کا مطلب کسی اور تاریخ سے بہت زیادہ ہے کیونکہ یہ وہ سال ہے جب چیزیں ویسی ہی ہیں جیسی کہ ساری دنیا میں اور یہی وجہ ہے کہ یہ اس کا خاتمہ ہے۔۔۔"

"آج رات سمندر کے دونوں اطراف میں بمبار اپنے راستے پر ہیں جو کہ زمین کو دوبارہ کبھی نہ دیکھ پائیں گے۔"

"یہ اس مقصد کا حصہ ہیں۔ کیوں؟"

"اچھا" اس نے کہا، "یہ کیا ہوگا؟ ڈیشیں دھوؤ۔"

انہوں نے احتیاط سے برتن دھوئے اور صفائی کے بعد ان کو رکھ دیا گیا۔ 8 بجکر 30 منٹ پر لڑکیوں کو بستر پر سلا دیا گیا اور شب بخیر کا بوسہ دے دیا گیا اور ان کے بستر کے ساتھ لگی ننھی روشنیوں کو غل کر دیا گیا اور دروازے کو تھوڑا سا کھلا چھوڑ دیا گیا۔

"مجھے حیرت ہوتی ہے۔" خاوند نے باہر آتے ہوئے اور پیچھے دیکھتے ہوئے کہا، ہاتھ میں سگار لئے وہ ایک لمحے کے لئے وہاں رکا۔

"کیا؟"

"اگر دروازے کو ہر طرح سے بند کر دیا جائے یا اسے تھوڑا سا کھلا چھوڑ دیا جائے

تاکہ ہم ان کو سن لیں جب بھی وہ ہمیں بلائیں"

"میں حیران ہوں اگر بچے یہ جانتے ہیں۔ اگر کسی نے ان کو اس بارے میں بتایا ہے۔"

"نہیں، یقیناً نہیں--- انہوں نے ہم سے یہ پوچھا تھا۔"

وہ بیٹھ گئے اور اخبار پڑھنے لگے، آپس میں باتیں کیں، کچھ دیر ویڈیو کی موسیقی کو سنا اور پھر انگیٹھی کے ساتھ اکٹھے بیٹھ گئے اور سلگتے کوئلوں کو دیکھنے لگے۔ جیسے ہی کلاک نے ساڑھے دس بجائے، پھر گیارہ اور پھر ساڑھے گیارہ۔ انہوں نے دنیا کے دوسرے تمام لوگوں کے بارے میں سوچا جو اپنے اپنے انداز میں اپنی شام گزار چکے تھے۔

"اچھا--" اس نے آخرکار کہا۔ اس نے اپنی بیوی کو کافی دیر تک بوسے دیئے۔

"جیسا بھی ہو، ہم ایک دوسرے کے لئے بہت اچھے ہیں۔"

"کیا تم رونا چاہتی ہو--" اس نے پوچھا۔

"نہیں، میں ایسا نہیں سوچ رہی۔"

انہوں نے اپنے گھر کا چکر لگایا، روشنیوں کو گل کیا، دروازے بند کئے اور پھر سونے کے کمرے کی جانب چلے گئے اور رات کے ملگجی اندھیرے میں برہنہ کھڑے ہو گئے۔ اس نے بستر پر سے چادریں اتاریں اور ان کو احتیاط سے تہہ کر کے ایک کرسی پر ڈال دیا جس طرح وہ ہمیشہ کرتی تھی اور باقی سارے کورز بھی پیچھے کی جانب دھکیل دیئے۔

"چادریں بہت صاف ستھری اور عمدہ ہیں۔" اس نے کہا۔

"میں بہت تھک چکی ہوں"

"ہم دونوں تھک چکے ہیں۔" وہ اپنے بستر میں گھس گئے اور لیٹ گئے۔

"ایک منٹ ٹھہرو--" اس نے کہا۔

اس نے اس کے اٹھنے کی آواز سنی اور وہ گھر کے پچھلی طرف چلی گئی اور پھر اسے جھولتے دروازے کی مدھم آواز سنائی دی۔ ایک لمحے بعد وہ واپس آ چکی تھی۔

"میں نے کچن میں پانی چلتا چھوڑ دیا تھا" اس نے کہا، "میں نے ٹونٹی بند کر دی ہے۔"

اس کے متعلق کچھ بھی کہنا مزاق تھا اور اس کو بھی ہنسنا پڑا۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہنسی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس نے جو کہا ہے، کیا وہ اتنی مزاحیہ بات تھی۔ آخرکار انہوں نے ہنسنا بند کر دیا اور اپنے رات کے پرسکون بستر پر لیٹ گئے، ان کے ہاتھ ہاتھوں میں تھے اور سر جڑے ہوئے تھے۔

"شب بخیر--" اس نے ایک لمحے بعد کہا۔

"شب بخیر" اس نے آہستگی سے کہا، "پیارے---"

☆☆☆☆☆

اَمجد اِسلام امجد ''پلیز ڈونٹ مائنڈ''

امجد اسلام امجد کا تعارف کرانا کچھ ایسا ہے جیسے کوئی پھول کا تعارف خوشبو سے کرانے کی کوشش کرنے لگے۔ اب تک نظم ونثر میں اس کی تقریباً سولہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، وہ کالم نگار بھی ہے، ڈرامہ نگار بھی، سفرنامہ نگار بھی۔ اس کی مقبولیت کا حلقہ لامحدود ہے۔ میرا یہ تعارف اس کی شہرت میں اضافہ نہیں بلکہ اس لامحدود جن کو بوتل میں بند کرنے کی ایک کوشش ہے۔

چند دن قبل کی بات ہے، مجھے پیغام ملا کہ امجد اسلام امجد ریاض میں اپنے ہم زلف کے ہاں پہنچ چکا ہے اور یہ کہ میں اسے فون کر لوں۔ اس پر مجھے بڑی ہنسی آئی۔ اس لئے نہیں کہ مجھے امجد کی لطیفہ بازی یاد آ گئی تھی۔ اس قسم کی ''سازیاں'' اور ''بازیاں'' تو امجد کے حوالے سے ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے اور ہم لوگ حقیقتوں پر صرف آنسو بہانے کے عادی ہیں، ہنسنے کے نہیں۔ مجھے ہنسی اس لئے آئی کہ امجد بھی کسی کا ''ہم زلف'' ہو سکتا ہے! ہم زلف ہونے کے لئے تو ''ہم'' کے ساتھ ساتھ ''زلف'' کا ہونا بھی ضروری ہے اور امجد کا زلف سے (یعنی اپنی زلف سے) وہی تعلّق ہے جو چیل کے گھونسلے کا ماس سے ہوتا ہے۔ بہرحال اپنی زلف سے تعلق کی محرومی کو اس نے سایۂ زلف تلے پناہ لے کر دور کر لیا ہے۔ قبل ازوقت ''فارغ البالی'' سے اس کی شاعری میں ''زلفِ جاناں'' کا تذکرہ ''چیزے دیگر'' کے طور پر آیا ہے۔

مجھے یہ خاکہ لکھتے ہوئے ایک مشورہ بھی ملا

نسیمِ سحر

کہ میں اور کچھ بھی لکھ دوں، امجد کے بالوں کو موضوع نہ بناؤں۔ اب آپ خود ہی بتایئے کہ جو چیز موجود ہی نہیں اسے موضوع کیسے بنایا جا سکتا ہے؟ ویسے مجھے یقین ہے کہ چاہے اس خاکے میں اُس کے بالوں کے حوالے سے کچھ بھی لکھ ڈالوں، امجد بُرا نہیں مان سکتا کیونکہ خود اسی کا قول ہے کہ چاہے بندہ ضائع ہو جائے، جملہ ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں بندہ ہمیں زیادہ عزیز ہے اور جملے چست کرنے کو بھی جی چاہتا ہے اس لئے کوشش یہی ہوگی کہ نہ یہ ضائع ہو نہ وہ۔ ویسے بھی امجد کا ذکر آئے اور خاکے میں مزاح کا رنگ نہ ہو تو یوں لگتا ہے جیسے کسی بلانوش کو لسی کا پیالہ یا کسی مُلّا کو وھسکی کا جام پیش کیا جا رہا ہو۔ چنانچہ امجد کا خاکہ لکھتے ہوئے مزاحیہ انداز اختیار کرنا میرا شوق نہیں بلکہ امجد کی شخصیت میں سے جھانکتے ہوئے شرارتی بچے کا تقاضا ہے۔

امجد کی شخصیت کا تذکرہ مزاح کے ذکر کے بغیر ادھورا سا لگتا ہے۔ کہنے کو اس نے نہایت سنجیدہ ادبی کام کئے ہیں۔ اس کی شاعری کے چار مجموعے۔ برزخ، ساتواں در، فشار۔ اور ذرا پھر سے کہنا کے عنوانات سے شائع ہو چکے ہیں۔ یہی چاروں مجموعے ''خزاں کے آخری دن'' کے عنوان سے کلیات کی صورت میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ گیتوں کا مجموعہ ''آنکھوں میں تیرے سپنے'' بھی شائع ہو چکا ہے۔ نیگرو شاعروں کی نظموں کا ترجمہ ''کالے لوگوں کی روشن نظمیں'' اور فلسطینی شاعروں کی نظموں کا ترجمہ ''عکس'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ انگلش میں امجد کی نظموں کا ترجمہ IN THE LAST DAYS OF AUTUMN کے نام سے آ چکا ہے۔ نثر میں اس کا سفر نامہ ''شہر در شہر'' کے عنوان سے اور کالموں کا مجموعہ ''چشمِ تماشا'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ امجد نے اپنا تخلیقی اظہار ایک اور اہم میڈیا یعنی ٹی وی کے ذریعہ بھی کیا ہے اور ''وارث'' اور ''دلیز'' جیسے کامیاب ترین سیریل لکھ کر بے انتہا مقبولیت حاصل کی ہے۔ یہ دونوں ڈرامے بھی کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اور دوسرے ٹی وی ڈراموں کے دو مجموعے بھی ''اپنے لوگ'' اور ''لہو میں پھول'' کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ امجد نے اپنی شاعری ہی میں نہیں، ڈراموں اور کالموں میں بھی اپنے ملکی حالات و مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں، غلط بخشیوں اور جبر و استحصال پر تنقید کی ہے، اس کا دل بھی ہر

بیچے فنکار کی طرح شدت احساس کا شکار رہتا ہے۔ مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک صاحب شدید سر درد کی شکایت لے کر ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ آپ فوری طور پر دماغی کام کرنا چھوڑ دیجیے۔ ان صاحب نے کہا "مگر جناب میں تو ٹی وی کے ڈرامے لکھ کر روزی کماتا ہوں"۔ ڈاکٹر نے جواب دیا "وہ بے شک لکھتے رہیے"۔ لیکن یہ لطیفہ یقیناً امجد اسلام امجد کے بارے میں نہیں ہے کیونکہ وہ ملکی مسائل پر کڑھنے کے باوجود سر درد میں مبتلا نہیں ہوتا اور نہ ڈراموں کے ذریعے عوام کو سر درد میں مبتلا کرتا ہے۔ اصل میں یہ سنجیدہ ادبی اور نیم ادبی قسم کے کام تو وہ شرما شرمی میں کر جاتا ہے، اس کا اصل میدان لطیفہ سازی اور جملہ بازی ہے جس میں تا حال اگر کوئی اس کا ثانی ہے تو عطاالحق قاسمی ہے۔ یہ دونوں ہی اس اصول پر کاربند ہیں کہ چاہے بندہ ضائع ہو جائے مگر جملہ ضائع نہ ہو، چنانچہ یہ دونوں اپنے جملوں کے ذریعہ بندے ضائع کرنے کا کام بڑی محنت سے کر رہے ہیں۔ عموماً ان کے جملے اتنے تہہ دار ہوتے ہیں کہ مخاطب اس وقت تو بے اختیار ہنس دیتا ہے مگر گھر پہنچ کر جب رات گئے سوچتے رہنے کے بعد اس پر اس جملے کے اصل مفہوم واضح ہوتے ہیں تو وہ کئی طریقوں سے سلگنے لگتا ہے۔ شاید اسی لیے امجد کو عموماً نصف شب کے بعد کئی ٹیلی فون کالز آتی ہیں۔ اصل میں یوں ہے کہ امجد نے اپنی ذات کے اندر مزاح اور خوش باشی کی ایک کھڑکی ہی نہیں بلکہ پوری بارہ دری کھول رکھی ہے جہاں سے تازہ ہوائیں ہر لحظہ چل کر اس کی ذات کو تھکن سے اور اس کے لہجے کو تھکان سے بچائے رکھتی ہیں۔ اسی لئے شاعری ہو یا نثر، وہ آج بھی تروتازہ لہجے میں لکھ رہا ہے اور یہ تازگی باسی سبزیوں پر پانی کا چھڑکاؤ کر کے حاصل کرنے والی مصنوعی اور عارضی تازگی نہیں بلکہ وہ تازگی ہے جو سچی تخلیق کے اندر سے خوشبو بن کر پھوٹتی ہے۔ اسی خوش باشی اور تازگی کا نتیجہ ہے کہ وہ ذہنی تناؤ کے ماحول میں رہتے ہوئے بھی ذہنی دباؤ کا شکار نہیں ہوتا۔ فارغ البال ہو جانا تو خیر اکثر دماغی محنت کرنے والوں کا مقدر رہتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ میں نے کبھی کسی خاتون کو فارغ البال نہیں دیکھا۔ یا تو یہ بیماری صرف مردوں پر ہی حملہ آور ہوتی ہے یا پھر خواتین دماغی محنت اس وجہ سے کرتی ہی نہیں کہ جب اس کا رد عمل ہی ظاہر نہیں ہوتا تو کیا فائدہ؟

امجد نے سیر و سیاحت بھی خوب کی ہے اب

تو وہ بیرونِ ملک ہونے والے اردو مشاعروں کے لئے پاکستان کی "ایکسپورٹ کماڈٹی" بن چکا ہے۔ ظاہر ہے ان سرگرمیوں میں اسے رومانی تجربات بھی ہوئے ہوں گے جن کا اظہار اس نے اپنی شاعری اور سفرناموں میں کیا ہے مگر بڑی احتیاط سے کہ کہیں کوئی اعتراف گناہ اُسے سنگساری کے انجام تک نہ پہنچا دے۔ تاہم "ہوم فرنٹ" پر اپنی وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے امجد کہتا ہے:

وہ اَور ہی ہوں گے جن کو امجدؔ نے مناظر کی چاہ ہوگی
مَیں اُس کے چہرے کو دیکھتا ہوں، میں اس کے چہرے کو دیکھتا تھا

.....

مگر یہاں بھی امجد ڈنڈی مار گیا ہے۔ اس نے ماضی اور حال میں تو ایک خاص چہرہ دیکھنے کا اعلان کیا ہے، مستقبل کے بارے میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا اور ابھی تو اسے جانے کتنے سفر کرنے اور کتنے نئے چہرے دیکھنے ہیں۔ شاید اس کے بارے میں اسی لئے ضمیر جعفری نے ایک مرتبہ ٹی وی پر اسلامائزیشن کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا:

"ٹی وی پر اسلام تو کم، امجد اسلام زیادہ ہے"

اب جب عمرہ کرنے کے بعد حاجی امجد اسلام امجد صاحب جبہ و دستار میں ملبوس، تسبیح بدست واپس جائیں گے تو اُمید ہے کہ وہ ٹی وی کو مشرف بہ اسلام کرنے میں ویسا ہی اہم کردار ادا کریں گے جیسا کہ حاجی سلطان راہی صاحب پنجابی فلموں کو مسلمان کرنے کے لئے ادا کر رہے ہیں۔ تاہم شاید امجد کو ایسا کرنے کا وقت نہ مل سکے کیونکہ سنا ہے کہ پاکستان کی کئی بال اُگانے کی دوائیں بنانے والی کمپنیاں انہیں ملین ڈالر کی ملازمت آفر کرنے والی ہیں۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ جب مرحوم سوویت یونین کے فالتو ہو جانے والے وزیر اعظم گورباشیف کو امریکہ اور یورپ سے ملین ڈالر کی ملازمت آفر ہو سکتی ہے تو امجد میں آخر کیا کمی ہے۔ بلکہ دونوں میں ایک بڑی واضح قدرِ مشترک بھی تو ہے۔ وہی فارغ البالی کی۔

یہ مضمون ختم کرتے ہوئے میں ایک اہم وضاحت کر دینا چاہتا ہوں اگر کوئی بہن بھائی یہ سمجھتا ہے کہ مجھے امجد کی فارغ البالی کا ذکر کرتے ہوئے شاید بڑی کمینی سی مسرت حاصل ہو رہی ہے تو وہ مجھے دیکھ کر غلط فہمی دور کر لے۔ اگرچہ ابھی تک فرق کچھ کچھ صاف ظاہر ہے لیکن یقین کیجیے کہ میرا بھی "فیوچر پراسپیکٹ" ہے، بس چند ماہ یا ایک آدھ برس کی بات ہے کہ میں بھی امجد جیسا ہونے والا ہوں اور امجد کا ذکر کر کے دراصل میں اپنا ہی مذاق اڑا رہا ہوں اور اس لئے امجد اسلام امجد پلیز ڈونٹ مائنڈ!

☆☆☆☆☆☆

ڈاکٹر نامہ [فکاہیہ]

تمنا ہے گلابوں سے میں اُلجھوں چنبیلی کے بھی سائے چاہتا ہوں
ڈاکٹروں کی دو چار باتیں پھر اُس کے بعد چائے چاہتا ہوں

.....

عرضِ مکرر کے طور پر میں آپ کو مسلسل شامتوں کی اقسام بتاتا چلوں، کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے۔ جب چیونٹی کی شامت آتی ہے تو اسے پر لگ جاتے ہیں۔ جب مکھی کی شامت آتی ہے تو وہ مکڑے کے جال میں پھنس جاتی ہے اور جب ہم جیسے بیماریوں کے مارے مریضوں کی شامت آتی ہے تو ہم ڈاکٹر حضرات کی طرف چل پڑتے ہیں۔

بھئی ہمارے ہاں ڈاکٹرز کیا ہیں.....؟ نیم حکیم خطرہ جان، ایک دفعہ تو ہمارے ساتھ بھی عجیب وغریب اور نہ سمجھ آنے والی صورت حال پیش آئی جب کسی ''ہما'' نام کی خاتون کا ٹیسٹ رزلٹ غلطی سے ہمیں تھما دیا گیا تو ٹیسٹ دیکھ کر یقین جانیے پیروں تلے زمین کھسک گئی اور اپنے آپ کو خاتون محسوس کرتے ہوئے میرے بدن میں محسوسات کی برقی رو اس تیزی سے دوڑنے لگی کہ گدگداہٹ اور آزاد خیالات ذہن میں آتے ہی بے اختیار منہ سے نکلا ''ہائے میری جان''۔ مگر جلد ہی میں اپنے ہوش وحواس میں واپس آیا اور دم تحریر اُسی رزلٹ کے بعد طبیعت کچھ سنبھل گئی تو لکھنے بیٹھ گیا۔

حضرات! اب تو ڈاکٹروں کی اتنی قسمیں آچکی ہیں کہ محبوب اور رقیب کی بھی اتنی ورائٹی عام نہیں ہوئی۔ کیونکہ ہر ڈاکٹر کا اپنا الگ ہی سٹائل ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں کی فیسیں، اندازِ بیاں اور معائنے کا طریقہ واردات بھی ایک دوسرے سے الگ ہوتا ہے۔ بھلا مریض خود کو ''دیوارِ مہربانی'' پر ہی کیوں نہ لٹکا دیں علاج مفت نہیں ہوتا۔ اگر مریض امیر زادہ، خان زادہ، نواب زادہ ہو تو ڈاکٹر صاحب دودھ، مکھن، دہی، پنیر کا مَسکا لگاتے ہوئے بغل گیر ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے مریض غریب ہو اور اپنی حالتِ زار بھی بیان کرے تو ڈاکٹر کی طبقاتی حِس جاگ اُٹھتی ہے اور مختلف ٹیسٹ لکھ کر مریض کو خطرے کا سگنل دیتے ہوئے اتنی دوائیاں لکھ دیتے ہیں کہ مریض کی دوائی پورے محلے کے لیے کافی

ہمایون خان

ہوتی ہیں - مریضانِ دل کی شریانیں تو ڈاکٹروں کی فیسیں سُن کر اور بھی سکڑ جاتی ہیں ہاں البتہ فیسوں اور بیماریوں کی بھی قسمیں ہیں- دل گُردے، جگر کی بیماری ضدی اور ڈھیٹ قسم کی ہوتی ہے اس کے برعکس پیٹ درد، قبض کی بیماری لاحق ہو تو ڈاکٹر کی فیس سنتے ہی رفع ہو جاتی ہے- اور تو اور بسا اوقات تو ڈاکٹر اپنے مریض سے یوں بھی مخاطب ہوتے ہیں:

کرتا ہے اپنا راستہ دُشوار کس لیے
پیسے نہ تھے علاج کے، گر تیری جیب میں
پھر یہ بتا ہُوا ہے تُو بیمار کس لیے

.....

جب سے لوگوں نے ہنسی مذاق کرنا، پیدل چلنا، کم کھانا، قہقہے لگانا، پیٹ بھر کے ہنسنا اور کم سونا بند کر دیا ہے اور چلنا بلکنا، سسکنا، گڑھنا، آہیں بھرنا زیادہ کر دیا ہے تو اعصاب اور معدے کے امراض کے ساتھ ساتھ دل گُردے، شوگر، بلڈ پریشر جیسے امراض میں ایسے اضافہ ہو رہا ہے- جیسے مہینے کی پہلی تاریخ پر بیگم کی فرمائشوں کا ہوتا ہے- آج کل ایسے ڈاکٹروں کی بھی کمی نہیں جو مریضوں کو چکر دینے کے ساتھ ساتھ اپنے رشتہ داروں اور جاننے والوں کو بھی چکمہ دینے کا ہنر جانتے ہیں- معائنہ کے دوران بات کو گھما پھیرا کر اور گاجروں میں مولیاں ملا کر ایسا انداز بیاں پیش کرتے ہیں کہ سب چکرا جاتے ہیں-

بعض ڈاکٹر صاحبان کو ہم نے بنفسِ نفیس دیکھا ہے کہ کلینک میں سگریٹ پیتے ہوئے اپنا رُتبہ بڑھانے کا رُعب جماتے ہیں کیوں کہ ہمارے ہاں بہت سے ماہرین نفسیات کا دعویٰ ہے کہ سگریٹ پینا ڈاکٹروں کے لیے ضروری ہے اس میں کوئی بُرائی نہیں وجہ یہ ہے کہ جس طرح کے خیالات، احساسات اور جذبات ڈاکٹر صاحبان مریض کے حق میں رکھتے ہیں سگریٹ کے دُھوئیں سے بآسانی باہر آجاتے ہیں- اسی کے ساتھ دانتوں میں ٹوتھ پک چباتے اور دباتے ہوئے اتنی گہری سوچ و بچار کے ساتھ دوائی لکھتے ہیں جیسے بیک وقت تشخیص کے ساتھ کوئی حتمی فیصلہ بھی صادر فرمادیں- بعض تو معائنہ کرنے سے پہلے نسوار منہ میں رکھتے ہوئے ایک آنکھ ایسی دبا کر بند کرتے ہیں جیسے ایک ہی آنکھ سے مریض کا الٹرا ساؤنڈ کر رہے ہوں اور تو اور آج کے ماڈرن دور میں کلینک میں ٹی وی، کیبلز تک چلاتے ہیں- اور ٹی وی دیکھتے دیکھتے مریض کا معائنہ بھی کرتے ہیں- کچھ ڈاکٹرز اتنے ماہر ہوتے ہیں کہ موبائل پر بات کرتے کرتے بھی مریض کا معائنہ کر لیتے ہیں - ہمارے ایک دوست گاؤں میں ڈاکٹر ہیں- ان کا انداز بیاں اور معائنہ واردات نرالے رنگ ڈھنگ کا ہوتا ہے- مریض کا معائنہ کرتے کرتے بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتے ہیں اور پھر کہتے ہیں انسان کو اللہ نے جو صلاحیت عطا فرمائی ہے بیک وقت استعمال کرنے سے حقِ بندگی ادا ہو جاتا ہے-

سونے پہ سہاگہ یہ صاحب تو راہ گزرتے لوگوں

سے مریض کے معائنے کے دوران دُعا سلام اور سبزی فروش سے خریداری بھی کر جاتے ہیں۔

بعض ڈاکٹر صاحبان بڑے نیک اور متقی بھی ہوتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں تسبیح تو دوسرے ہاتھ سے چیک اَپ کرتے ہیں اور بعض تو (وقفہ برائے نماز) کی تختی دروازے پر آویزاں کر کے نیک نام بننے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ اب تو بات مزید بڑھ گئی ہے کہ بعض ڈاکٹر مریضوں کو نفسیاتی گرویدہ بنانے کے لیے کسی سکرین پر مذہبی ویڈیو پروگراموں کے ویڈیوز تک چلا دیتے ہیں۔ آج کے دورِ جدید کے ڈاکٹر صاحبان روشن خیال اور آزاد خیال ہیں۔ کسی شاعر نے اس کی تصویر کشی اس طرح کی ہے:

ستارے توڑ سکتا ہے یہ دریا موڑ سکتا ہے
کبھی تو بِن قزح کے ساتھ یہ ناطہ جوڑ سکتا ہے

حضرت! غصہ نہ کریہ ہے ہمارے دور کا ڈاکٹر
کھلی اس کو اجازت ہے یہ کچھی چھوڑ سکتا ہے

ڈاکٹر اور مریض دُنیا کے دو اہم کردار ہیں کہ جن سے دُنیا کی رُونقیں، خوشیاں، دلچسپیاں، سرگرمیاں، اُداسیاں، دوائیاں اور جدائیاں تک جنم لیتی ہیں۔ ڈاکٹر اور بیوی کی خاموشی کوئی اچھی علامت نہیں ہوتی بلکہ ضرور کسی طوفان کی پیشنگوئی کرتی ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ ڈینٹل ڈاکٹر وہ واحد ہستی ہے کہ سیاستدان، داماد، ساس سسر اور سالیوں تک سے منہ کھلوانے کا ہنر اور حکم جاری کر سکتا ہے۔

ڈاکٹروں کے اتنے مریض ہوتے ہیں کہ اُن کو یہاں تک یاد نہیں رہتا کہ کون عزیز ہے اور کون مریض۔ ایسے ہی ایک ڈاکٹر کے پاس ایک خاتون آئیں۔ ڈاکٹر نے شناسا چہرہ دیکھ کر یاد کرتے ہوئے کہا!

''محترمہ! آپ کو کہیں پہلے بھی دیکھا ہے''۔

محترمہ فرمانے لگی ''آپ نے مجھے پہلی دفعہ اُس دن دیکھا تھا جس دن ہماری شادی ہوئی تھی''۔

ڈاکٹر جلدی میں ''اچھا اور محترمہ آپ کرتی کیا ہیں؟''

محترمہ! ''آپ ہی کے دو بچے پال رہی ہوں بیوقوف''۔

اسی انداز کے ایک معائنے سے ہم خود بھی اس وقت گزرے جب ہمیں عرق النسا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی شفقت اور محبت دکھائی اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

''میاں! میں تہہ دل سے دُعا گو ہوں کہ آپ جلد صحت یاب ہو جائیں''

میں خوش ہوتے ہوئے بولا ''جناب! آپ کی نیک تمنا، آرزو اور دُعا ہمیشہ میرے ساتھ رہے''

ڈاکٹر نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے دوائی لکھ کر مجھے جلدی سے رُخصتی کا پروانہ تھما دیا، وہ تو بعد میں کسی دوست سے معلوم ہوا کہ تمنا آرزو اور دُعا اُن کی بیگمات کے نام ہیں۔

☆☆☆☆☆

گاؤں والا

میں یاری دوستی کا ذوق رکھوں
پسندیدہ ہے میری آشنائی

میں بیلے پر کبڈی کھیل کھیلوں
جو لہروں نے مجھے تیزی سکھائی

میں نغمہ بار کھیتوں میں پھرا ہوں
بھری فصلوں نے بخشی ہے رسائی

اطاعت گاؤں کے بچّوں سے سیکھی
بزرگوں نے سکھائی ہے بڑائی

میں لکھوں خوش خطی کاغذ پہ ایسے
مرے دل میں ہے روشن روشنائی

ملے پنگھٹ سے نینوں کو ستارے
بھلی ہے آنچلوں کی رونمائی

گھنے تھے گاؤں میں والد کے سائے
بڑی میٹھی تھی جنت مامتائی

ستارہ وار میں گلیوں میں گھوموں
مرے آگے ہے رقصاں خوش ادائی

مدھر جھرنے پہ میرا ہے ٹھکانا
یہی موسیقیاں میری کمائی

درختوں پر پرندے ناچتے ہیں
یہاں جب بانسری میں نے بجائی

آصف ثاقب

ہر دل عزیز امجد اسلام امجد کے لیے

اے پیارے امجد!
ہمارے امجد!
کہاں گئے ہو
ہم اپنی اپنی روانیوں میں کہاں پہ پہنچے
تم اپنی دھن میں کہاں چھپے ہو
یہ کس سے پوچھیں
تھکن سفر کی ہمارے پیروں سے دل تک آئی
تو مڑ کے دیکھا
مڑ کے دیکھا تو
تم نہیں تھے، کہاں چھپے ہو!
اے پیارے امجد!
ہمارے امجد
سبھی کے امجد
تم تو بھائی یہیں کہیں
اس ہجوم یاراں کے بیچ بیٹھے کوئی لطیفہ سنا رہے تھے
نہ جانے کس شام کی اٹھا میں
اتر گئے ہو
بھلا کوئی اس طرح بھی جاتا ہے جانِ یاراں!
بلا کے ڈرامہ نگار ہو تم
ہنسی ہنسی میں رلا گئے ہو
ہماری آنکھوں سے آنسو ٹپکے تو ہم نے جانا
کہ جیسے تم
اشکِ ہجر بن کر
ہماری آنکھوں کی پتلیوں پر ہی جم گئے ہو
اے پیارے امجد!
ہمارے امجد!
سبھی کے امجد

ایوب خاور

نوٹ: محترم ایوب خاور یہ نظم بیاض شمارہ فروری 2023 میں گوشہ امجد اسلام امجد میں شامل نہ ہو سکی۔
ہم معذرت خواہ ہیں۔

تمھارے چار سو میں ہوں

فرحت پروین

''کبوتر کے پروں پر لکھ کے جو پیغام بھیجا تھا
ملا تم کو؟''
ابھی تو رنگ بھرنے تھے بہت سے میں نے لفظوں میں
بھلا بیٹھی جو عجلت میں
سو تتلی کو روانہ کر دیا ہے اس تعاقب میں
مگر پھر نا گہاں دل میں خیال آیا
مرا سوزِ دروں شاید عیاں پھر بھی نہ ہو پائے
تمہاری سمت اب محوِ سفر ہے ایک بلبل بھی
مگر وہ ہوک جو رہ رہ کے اٹھتی ہے مرے دل سے
تڑپ اسکی سما پائے گی کیا بلبل کے نغمے میں
سو لازم تھا کہ کوئل کو بھی بھیجوں میں
مکمل ہو گیا میرا سندیسہ مطمئن تھی میں
کہ اک جھونکے نے سرگوشی میں پوچھا یہ شرارت سے
''کہو تو میں تمھارا لمس لے جاؤں؟''
نہ جانے کیوں چھلک اٹھیں مری آنکھیں
گھٹا نے جھک کے آنسو پی لیے میرے
ہوا کے سنگ وہ بادل فضاؤں کے سفر میں ہے
سو اب تم جس طرف جاؤ جدھر دیکھو
تمہارے چار سو میں ہوں

ضیاء محی الدیں کے ساتھ اِک جہان اُٹھ گیا

زمیں سَرَک گئی کہ سر سے آسمان اُٹھ گیا
ضیاء محی الدیں کے ساتھ اِک جہان اُٹھ گیا

دیا تھا جو انہوں نے، وہ قلم تو میرے پاس ہے
ہے دُکھ کہ حُرمتِ قلم کا پاسبان اُٹھ گیا

اُسی کے دَم قدم سے تھی بہارِ بزمِ فکر و فن
وہ لے کے اپنے ساتھ سارا گلستان اُٹھ گیا

وہ اِک ادارہ تھا، وہ اپنی ذات میں تھا انجمن
سخنوروں کو دے کے آن، بان، شان اُٹھ گیا

زبان اور بیان کی بھی اِک کسوٹی آپ تھے
کہوں میں کیا کہ ناپا کا بھی نگہبان اُٹھ گیا

جو علم کے جلائے تھے چراغ، وہ بُجھے نہیں
نقوشِ پا ہیں اب بھی، میرِ کاروان اٹھ گیا

زمین میں اُتر گیا، جو ایک پیڑ تھا گھنا
ہے چلچلاتی دھوپ، سر سے سائبان اُٹھ گیا

بڑا تھا اِک دماغ، جس کا حافظہ بلا کا تھا
کتابوں کا وہ چلتا پھرتا اِک جہان اُٹھ گیا

سوال بھی اُٹھائے، جس نے خود جواب بھی دیئے
وہ لاجواب نکتہ بیں، وہ نکتہ دان اُٹھ گیا

تراشے تھے جو ہیرے وہ چمک رہے ہیں آج بھی
صحافت و صدا کا تھا جو نگہبان اُٹھ گیا

جو بیج اس نے بوئے تھے، وہ بن گئے ہیں اِک شجر
وہ رنگ دے کے اپنے، ہو کے شادمان اُٹھ گیا

ابھی تک اُس کے رنگ ہیں فضاؤں میں بسے ہوئے
ادھوری چھوڑ کر جو اپنی داستان اُٹھ گیا

صدا و صوت کے رموز رکھ دیئے ہیں کھول کر
بسا دِلوں میں پہلے، پھر وہ خوش بیان اُٹھ گیا

عمر، ظفر، اِرم غنی کے ساتھ بھی سُنا اُسے
وہ دے کے اپنی یادوں کا حسیں جہان اُٹھ گیا

شعور و آگہی کی روشنی لُٹائی عمر بھر
ہے دکھ وہ ہم سے علم و فن کا پاسبان اُٹھ گیا

سید عارف معین بلے

دائرہ در دائرہ

نسیم نازش

یہاں ہر ایک قسمت میں لکھا ہے
مسلسل دائروں میں گھومتے رہنا
سفر سارے سفر یونہی کٹے ہیں
ہماری زندگی بھی ایک ہی مرکز کے چکر کاٹتی ہے
وہ مرکز
صرف تھوڑی سی محبت اور عزت
اور اک نان جویں کی آرزو ہے
کبھی جو مل نہ پائے ایک ایسے ہمسفر کی جستجو ہے
میں برسوں سے کسی آندھی کے جھکڑ کی طرح
اس دائرے کے رقص پیہم سے
بہت گھبرا گئی ہوں
کہ میں چکرا گئی ہوں
مگر یہ تو ازل کا سلسلہ ہے
یہاں سب کے لئے اک دائرہ ہے
بشر ہوں یا کہ وہ سیارگاں ہوں
ہر اک ذرے کے اندر ناچتے نادیدہ ذرے ہوں
یہاں ہر ایک کی قسمت میں لکھا ہے
مسلسل دائروں میں گھومتے رہنا

مون سون

شبہ طراز

پھر تمنا اُڑان بھرتی ہے

خواب آنکھوں میں پھر مچلتے ہیں

پھر پرندے ہرے سمندر پر

رنگ سارے چھڑکتے جاتے ہیں

پھر ہواؤں میں جاگتی ہے کسک

پھر کسی یاد کی سیہ آندھی

دل کے اطراف سے گزرتی ہے

ایک لمحہ کہیں پہ روتا ہے

زندگی زاویہ بدلتی ہے۔۔۔

دور کچھ پربتوں کے دامن میں

ایک بستی میں شام ڈھلتی ہے۔۔!

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ایک چھب تھی کہ نگاہوں میں گھلی جاتی تھی

غرقِ دریائے انا ، ماہِ انا اپنا تھا

امجد اسلام امجد کی یاد میں

ایک روشن ستارہ ڈوب گیا
ہاں وہی جاں سے پیارا ڈوب گیا

منزلوں کا اشارہ ڈوب گیا
موت سے تو مفر کسی کو نہیں

علم و فن کا غرور تھا امجد
آخرش جاں وہ ہارا ڈوب گیا

فن کا وہ استعارہ ڈوب گیا
جو ادب کا تھا اعتبار جلیل

اس کے فن پارے روشن و رخشاں
وہ ادب کا شمارہ ڈوب گیا

روشنی میں وہ سارا ڈوب گیا

اس کے کردار ہیں امر سارے

خود اجل سے وہ ہارا ڈوب گیا

دیکھتا تھا وہ ساحلوں سے جسے

اس بھنور میں کنارا ڈوب گیا

جیت، امید اور رجا کا نقیب

موت سے وہ بھی ہارا ڈوب گیا

آسمانِ ادب کا ماہِ منیر

آج امجد ہمارا ڈوب گیا

زندگی جس پہ ناز کرتی تھی

احمد جلیل

تصویر

اسم اللہ کی برکت سے بنا دی تصویر
رونقِ نقشۂ دنیا پہ اجالی تصویر

شوق آنکھوں میں چمکتا تھا نگہبانی کا
دل کی دھڑکن میں دھڑکتی تھی یہ پیاری تصویر

ناز تھا ہم کو ستاروں سے بھری جھولی پر
قابلِ رشک تھی نظروں میں ہماری تصویر

ہر طرف چین تھا تسکیں تھی رواداری تھی
ہائے وہ لوگ پرانے وہ پرانی تصویر

پیش قدمی سے اُڑی خاک اصولوں کی یہاں
اَٹ گئی گردِ مفادات سے پوری تصویر

دردِ تقسیم سہا دل نے مگر آنکھوں سے
اشک چھلکا نہ کہیں دیکھ کے آدھی تصویر

غیرتِ حُبِّ وطن دِل سے مٹا بیٹھے اور
مَیلی نظروں کے لیے خوب سجائی تصویر

آئنے زنگ زدہ اور نگاہیں مغرور
دیکھتا کون گریبان میں اپنی تصویر

دیکھ کر رنگ بدلنے کا عمل چہرے پر
بارہا، خوف کے عالم میں بھی لرزی تصویر

روح بیکار، بدن سُست، سفر لاحاصل
ذہن کشکول بدست اور نوابی تصویر

ہم نے تہذیب وتمدّن سے کیا ہے دھوکا
قابلِ فخر نہیں اپنی سماجی تصویر

ہر نئے خواب کی تعبیر بھیانک نکلی
زندگی اور ہوئی تلخ ، پکاری تصویر

کِس تعجب سے ہمیں دیکھ رہی ہے آکاش
حالتِ زار پہ خود اشک بہاتی تصویر

احمد سبحانی آکاش

امجد اسلام امجد

ہر ایک نظم و غزل بے مثال لکھتے ہیں
نئی زمین میں تازہ خیال لکھتے ہیں

اُنھی کے نام سے شعر و سخن کی ہے پہچان
فراق و ہجر کے وہ خدّ و خال لکھتے ہیں

جہاں جہاں بھی وہ تیر و کماں لکھے دیکھیں
وہاں وہاں پہ محبت کی ڈھال لکھتے ہیں

شجر شجر پہ لکھا نام اُن کا دیکھا ہے
کہانی پیار کی وہ ڈال ڈال لکھتے ہیں

لکھا ہے اوروں نے آغاز عشق کا لیکن
وہ چاہتوں کا ہمیشہ مآل لکھتے ہیں

جواب جس کا نہیں ہے کسی کے پاس میاں
کتابِ شعر میں ایسا سوال لکھتے ہیں

بہت سے اُن کے ڈرامے کمال لگتے ہیں
وہ جو بھی لکھتے ہیں بے حد کمال لکھتے ہیں

حسین خواب کی تعبیر لکھ رہے تھے وہ
کہیں گلاب، کہیں پر گلال لکھتے ہیں

قدم قدم پہ ''محبت'' نے آ لیا تھا اُنھیں
اِسی لیے تو محبت کو جال لکھتے ہیں

وہ جانتے ہیں تقاضے نئے زمانے کے
ہر ایک بات کو وہ حسبِ حال لکھتے ہیں

وہ حمد و نعت و مناقب بھی لکھتے رہتے ہیں
ہر ایک نکتے کو وہ دیکھ بھال لکھتے ہیں

کبھی کبھی تو یہ لگتا ہے جیسے امجد کو
نہیں وہ لکھتے، اُنھیں ماہ و سال لکھتے ہیں

اُنھیں عُلومِ زمانہ پہ دست رَس بھی ہے
کہیں کہیں پہ ستاروں کی چال لکھتے ہیں

خدا ہی جانے اُنھیں کتنا علمِ دنیا ہے
کہ قارئین کے دل کا بھی حال لکھتے ہیں

کہیں امیر کا لکھتے ہیں رازِ دل امجد
کہیں فقیر کا جاہ و جلال لکھتے ہیں

اِسی لیے تو عبارت سے پیار ہے اُن کی
سطر سطر وہ قلم کو سنبھال لکھتے ہیں

کہاں کہاں پہ قلم کار کو مہارت ہے
ہے کس کا حوصلہ، جرأت، مجال لکھتے ہیں

وصالِ یار کی لذّت وہ بھولتے ہی نہیں
کچھ ایسے اپنی طبیعت کا حال لکھتے ہیں

ملے ہیں اُن سے کئی بار بالمشافہ ہم
اِسی لیے اُنھیں شیریں مقال لکھتے ہیں

ادب کے حُسن سے واقف ہیں شاعری میں ندیمؔ
جمالیات کے جیسے جمال لکھتے ہیں

ریاض ندیم نیازی

بلوغت کی ایک نظم

کھل جا سم سم

کھل جا سم سم---

کھل جا سم سم کہنے سے بھی غار دہانہ

کب کھلتا ہے!

میں نے اپنے تشنہ، ترسے گرم لبوں سے

نیند کے ماتے تن پر

ہلکے ہلکے دستک دی تو

کوئی نہیں تھا

کنڈلی مار کے بیٹھی دھوپ سے خود کو

ڈسوانے کی لذت

اب شہوت میں بدل گئی تھی

جسم کی وحشت الماری میں اِک ہینگر

سے لٹک رہی تھی

اس کھڑکی کی انگڑائی میں ایک خزانہ

دہک رہا تھا

ایک برہنہ مست کنواری خواہش تھی جو

اب دو مونہی ناگن بن کر پھن پھیلائے

جھوم رہی تھی

بیوہ رات کی ترسی آنکھیں کومل لہجہ چوم

رہی تھیں

سورہ یوسف پڑھتے پڑھتے

میری سانسیں پھول گئی تھیں

گرچہ مجھ پر

غار دہانہ کھلا ہوا تھا---

لیکن میں ہی

اپنی پیاس کو تنہا چھوڑ کے

بھاگ آیا تھا

زعیم رشید

خاک ہو جائیں گے

پیش کرتے ہیں حاضرہ تصویر
شعر حالات کا ، خلاصہ ہیں
جو بڑھاتے ہیں حوصلہ میرا
میرے قاری مرا ، اثاثہ ہیں

یوں ہی پڑھتے رہے کتابوں سے
معنی اس لفظ کے ، مرے بھائی
اس کی پیشانی جب سے دیکھی ہے
مہ جبیں لفظ کی ، سمجھ آئی

چھینا جھپٹی کا اب ہے وہ عالم
ڈاکو ہر اک ، دکھائی دیتا ہے
اب تو اتنے ہیں لگ ، چکے پودے
شہر جنگل دکھائی ، دیتا ہے

ہے یہ فطری سنگھار ، کا موسم
تیرے جوبن نکھار ، کا موسم
ہر طرف سبزہ پھول خوشبوئیں
کتنا پیارا بہار ، کا موسم

دانت موتی یہ ہونٹ ، یاقوتی
حسن سے جن کے ہیں سویرے بھی
سوچتا ہوں کہ ایک ، دن عاصم
خاک ہو جائیں گے ، یہ چہرے بھی

عاصم بخاری

فروٹ کیک

تُم کاٹو گے
میرے راستے کو
تمھارے پاس کالی بلی بھی نہیں
کہاں سے
نحوست کے آکٹوپس
روایات کی زنجیریں لے آئے ہو
میں صدیوں سے
آنسوؤں کے سمندر پہ بہہ رہی ہوں
مجھے خوابوں کی سبز ڈولی میں
بٹھا کر
فروخت کیا جاتا ہے
کبھی گندے ہاتھوں سے
میرے حُسن کی توہین ہوتی ہے
کبھی بانجھ مرد کی بے ثمر ساعتوں سے
سمجھوتہ کرتی ہوں
کبھی اکلاپے سے لپٹ کر جاگتی ہوں
کبھی شوہر کی غیر موجودگی میں
رات کے دروازے پہ کھڑے
بہکے سایوں کی دستک سنتی ہوں
غیرت کے باعث قتل
میرے شناختی کارڈ کا علامتی نشان ہے
میں کبھی بدتمیز ہوں
کبھی لادین
جسے ہجوم کی چیخ پکار
ایک فتوے کی روشنی میں بُجھا سکتی ہے
مجھے جاہل رکھنے
بوجھ سمجھنے والو!
میں تمھاری بے راہ روی کی خوراک نہیں ہوں
تُم مجھے عورت کی بجائے انسان
محبت کی نظر سے دیکھنا
کب شروع کرو گے؟؟

امجد بابر

نثری نظم

پھول چہرے پہ کیوں اداسی ہے
بین کرتی ہے گھر کی خاموشی

کیسی شکستگی ہے قدموں میں
دل کا مسکن تنہائی ہے

اتنے بوجھل کیوں
کسی دوست دار دشمن نے

ہو گئے ہیں دن
خوب دوستی نبھائی ہے

راتیں کٹتی ہیں کیوں اداس اداس
نام لوں بھی تو کیسے لوں

دھواں اٹھتا ہے آشیانوں سے
نام لینے میں رسوائی ہے

کس نے لوٹا ہے

میرا خواب نگر

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لڑکھڑا کر دم نہ دے دیں ڈگمگاتی دوریاں
دل میں بجھتی لو کی صورت کپکپاتی دوریاں

امجد اسلام امجد کی نذر

تری آنکھ میں وہ جو خواب تھا اُسے بھول جا
کھلی آنکھ تو وہ نہیں رہا اُسے بھول جا

ترے قلب میں جو خیال تھا اُسے یاد رکھ
جو نہیں مِلا تو نہیں مِلا اُسے بھول جا

وہ بہار بن کے جو چھا گیا وہ قرار تھا
جو چلا گیا و چلا گیا اُسے بھول جا

جو خمار تھا ترے ذہن پر اُسے کر فزوں
جو غبار تھا اُسے بھول جا، اُسے بھول جا

کوئی درد ہو، کوئی کرب ہو اُسے دے اُڑا
تجھے بے وفا نے بُھلا دیا اُسے بھول جا

ترے ہاتھ میں جو لکیر تھی اُسے کر عیاں
مِرے یار آ، مِرے ساتھ آ، اُسے بھول جا

یہ محبتوں کا طریق ہے اِسے پیار کر
وہ حقارتوں کا تھا راستہ اُسے بھول جا

یہ عجیب سی ہے جو روشنی اِسے پاس رکھ
اِسے ساتھ رکھ کے تو مسکرا، اُسے بھول جا

اُسے رنج و غم تو نوآز دے کسی شام کو
یہی زندگی کا ہے فیصلہ، اُسے بھول جا

سید نواز شاہ بخاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آواز کا جادُو بھی جگانے نہیں دیتے
چڑیوں کو وہ اَب شور مچانے نہیں دیتے

خطوط

نسیمِ سحر

جناب عمران منظور مدیرِ اعلیٰ اور اراکینِ مجلسِ ادارت، سلام مسنون۔

سرورق پر ہی خالد احمد اور امجد اسلام امجد (مرحومین) کی تصاویر دیکھ کر دل پر رنج اور اداسی کی ایک لہر غالب آ گئی اور جب جب ''بیاض'' کا یہ شمارہ کوئی تخلیق پڑھنے کے لئے اٹھایا تو یہی دو تصاویر دل و ذہن پر حاوی رہیں۔ چنانچہ اس شمارے کا مکمل مطالعہ کرنے کے باوجود اس خط میں اس کی تخلیقات پر تبصرہ کرنے کے بجائے امجد اسلام امجد ہی کی کچھ یادیں تازہ کروں گا۔ یہ یادیں اس لیے بھی تازہ ہو گئیں کہ پرسوں ۲ر مارچ ۲۰۲۳ء کو ان کی یاد میں اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد میں ایک عالمی سطح کی تعزیتی تقریب منعقد ہوئی تھی جس میں پاکستان کے علاوہ دیگر کئی ممالک سے امجد کے چاہنے والوں نے ان کی شخصیت و فن کے مختلف گوشوں پر آن لائن اظہارِ خیال کیا، اور جو ادیب و شاعر اس تقریب میں موجود تھے ان میں سے بھی بہت سے سینئر ادیبوں کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی مگر قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ نہ نکلا، حالانکہ میرا خیال تھا تقریب کے منتظمین امجد اسلام امجد سے میری طویل دوستی سے آگاہ ہوں گے۔

شاید میرے علاوہ کوئی اور یہ دعویٰ نہ کر سکے کہ ان کا سب سے قریبی ''ہم عصر'' میں ہی تھا کہ ہم دونوں کا سنِ پیدائش ایک ہی ہے، ۱۹۴۴ء کے فروری میں مَیں اور اگست میں امجد اسلام امجد پیدا ہوئے تھے۔ جن دنوں میں سعودی عرب میں تھا کئی بار وہ جدہ، ریاض اور دمّام تشریف لائے، ۱۹۹۰ء میں ان کے اعزاز میں ہونے والی ایک تقریب میں مَیں نے اُن پر لکھا ہوا خاکہ پڑھا تو سامعین کے علاوہ خود امجد اسلام امجد نے بھی بے تحاشا داد دی جس کی گواہی ان دنوں وہاں مقیم کئی ادیب بھی دیں گے۔ اس کے علاوہ جدہ میں ہی ان کے اعزاز میں ہونے والے کئی مشاعروں کی نظامت کا اعزاز بھی مجھے حاصل ہے، ایک مرتبہ جناب عطاالحق قاسمی اور امجد اسلام امجد کا قیام زیادہ دن تک رہا تو کئی دوستوں کے گھروں میں ان کے لئے خصوصی محفلیں سجیں، راقم السطور ان تمام محافل میں شریک تھا، اور ان نجی محفلوں میں گھنٹوں کے حساب سے جو لطیفہ بازیوں کی محفل ہوتی تھی ان میں بھی حاضر تھا۔ دمام میں محترمہ فرحت پروین کے ہاں ہونے والے مشاعرے کے سلسلے میں بھی ان دونوں شخصیات کے ساتھ پروفیسر حسین سحر (مرحوم) اور میں تین چار دن تک قیام پزیر رہے۔ پھر میری پاکستان واپسی کے بعد بھی ان سے کئی ملاقاتیں رہیں۔ بہرحال یہ تفصیل تو ایک مضمون کی متقاضی ہے، فی الحال صرف ''ریکارڈ کی درستی'' کے لیے لکھ رہا ہوں کہ مضمون لکھنے کے لئے وقت درکار ہے۔

مزید کچھ لکھنے کے بجائے میں نے ۱۹۹۰ء میں امجد اسلام امجد کا جو خاکہ لکھا تھا وہ اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں کہ بیاض میں اس حوالے سے میری حاضری لگ جائے۔

محمد اشرف کمال

محترم عمران منظور، نعمان منظور صاحب

السلام علیکم

مارچ ۲۰۲۳ء کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ دیدہ زیب سرورق امجد اسلام امجد اور خالد احمد کی تصاویر سے مزین ہے۔ اس میں شامل غزلیں، نظمیں اور تخلیقی و غیر تخلیقی نثری فن پارے اپنی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔

شروع میں حمد و نعت کے گلدستے مہکتے ہوئے محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ بقول محمد انیس انصاری:

ایک حیرت کدہ کھلا ہے آنکھ ہے اور قدرتیں تیری

خالد احمد کا نعتیہ شعر انسانی تکریم کی تفسیر لیے ہوئے ہے:

تو نے ہر شخص کی تقدیر میں عزت لکھی
آخری خطبے کی صورت میں وصیت لکھی

اس شمارے میں خالد احمد اور اسلام امجد کے حوالے سے خوبصورت اور پر معنی پیرائے میں لکھے گئے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔
اس شمارے کی شاعری کے نسائی حصے کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اس کی بڑی آسانی کے ساتھ تانیثی قرأت ممکن ہو سکتی ہے۔
خالدہ انور نے زندگی اور عشق کے ناکام تجربوں کی صورت میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مت پوچھیے یہ زیست کٹی کس عذاب میں
ہر تجربہ تھا سانس کا ناکام تجربہ

سعدیہ بشیر کی غزل میں تماشے، بہانے، چاند تاروں کی آرزو میں گرنے والے آنسوؤں کو محسوس کیا جا سکتا ہے کہ تمام زمانے ان ہی دو دنوں میں سفر کرنے میں گزر گئے۔ عورت کے کرب اور زیست کے شاخسانے کے حوالے سے تازیانوں کا ذکر ملتا ہے۔ جن کے حصے میں رات بھی آدھی آئی۔

چاند تارے لیے رات آدھی رہی
ایک آنسو گرا، سو فسانے لیے

تسنیم کوثر کی غزل میں ایک للکار موجود ہے، وہ کسی انسان کی ذات پہ پہرے لگانے اور اس کی آواز کو بغاوت قرار دینے کے خلاف آواز بلند کرتی نظر آتی ہیں:

میری جرأت پہ نہ الزام بغاوت کا لگے
اور مری ذات کے حصے نہ بنائے جائیں

رخشندہ نوید نے عورت کی ذمہ داریوں، گھر داری، کھانا پکانا اور سوکھی روٹی کی عکاسی خوب اچھے انداز میں کی ہے:

چاند جل بجھ گیا ہو گا تنور میں
سوکھی روٹی دھری ہے مرے ہاتھ پہ

کوکی گل نے اپنے جذبات کو لکھتے ہوئے تفصیل میں جانے کے بجائے اسے قیامت قرار دیا ہے جو کچھ کہ عورت کے دل پہ گزرتی ہے:

جیسے بھی وقت گزارے تمھیں، تم کوکی گل!
دل پہ جو بیتی، فقط اس کو قیامت لکھنا

سمیرا یوسف نے ایک غزل میں بڑے لطیف جذباتی رچاؤ کے ساتھ اپنے خوبصورت خیالات کا اظہار کیا ہے جب کہ دوسری غزل میں قسمت کی نامہربانی، پلکوں کے ساتھ رونے کا وظیفہ، دل کے کھلونے کا ٹوٹنا، اور آخر میں یہ بھی یقین کہ اسے اپنا مقصدِ حیات مل جائے گا:

ٹوٹنا تھا اخیر دونوں کو
ایک دن دوسرا کھلونا تھا

زیبا نور کی شاعری میں جدائیوں کے دراز سلسلے دکھائی دیتے ہیں، ٹوٹے وعدوں اور درد سے بھرے منظروں کی لفظی عکاسی ملتی ہے۔

میری تصویر جب بنی ہو گی
درد منظر سے پھوٹتا ہو گا

اقرا انصاری کی شاعری میں جذبوں کی اٹھان اور رفاقتوں بھرے وصل کی پکار سنائی دیتی ہے۔ ایک حسرت ہے پاس آنے کی جو ان کے لفظوں سے جھانکتی ہے

اس سے پہلے کہ بیچ میں رونے لگوں
جھوٹ بولو ذرا، ہنساؤ مجھے

فرح رضوی کی غزل میں زندگی اور اس کے مختلف مدارج کو سمجھنے کے حوالے سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ انھیں جو بھی رنج ملا وہ شدت اور گراں انجام پہنچنے کے بعد ملنے والی آگہی کے ساتھ ملا جس کی وجہ سے اس کی کسک دو چند ہو گئی۔

یہ ایک رنج مگر آگہی کے ساتھ ملا
ہمیں گزار کے آئی بری گھڑی کی سمجھ

رخسانہ سمن کی شاعری میں شدت جذبات کے ساتھ کسی کھونے والے کے بارے میں کچھ گمان ملتے ہیں

شب اداس میں نصرت کو گنگناتے ہوئے
وہ مجھ کو یاد کرے گا دیا جلاتے ہوئے

دردانہ نوشین خان کا افسانہ "ایک آواز" میں بھٹکتے کتے کا بلی کو کاٹ کے مار ڈالنے کا منظر کی علامتوں کو بیان کرتا محسوس ہوتا ہے۔ رات کا خوف، گونجتی آوازیں اور خونخوار آدم خور آوازیں جن اشاروں اور کنایوں کو پیش کرتی ہیں انھیں ہم تانیثیت کے تناظر تک لے جا سکتے ہیں۔
شمیم سعید کا افسانہ "چیونٹی کا گورکھ دھندہ" عورت کے مختلف روپ اور ان کے ساتھ لوگوں کے رویوں کو بیان کرتا ہے۔ ماں کے روپ میں اولاد کا دیا ہوا جدائی کا دکھ، بیٹیوں کو ماں کا گھر سے نکال دینے کا افسوس، ایک واقعہ مرد کا ڈھیٹ اور عورت کا تھکن زدہ اور شکست خوردہ بیان کیا گیا ہے۔ دو لائنیں دیکھیے:
"مرد تو ہمیشہ کا ڈھیٹ ہے خود کو ہار کر بھی مضبوط بنائے رکھتا ہے۔ لیکن یہ کومل سی عورت ـــ تھکن تو دیکھو اس کے چہرے پر ملال بھی، شکست خوردہ ملال ـــ کہ ماں بنی ہی کیوں تھی؟ اپنی تخلیق کی صلاحیت پر شرمندہ" (ص ۲۱۱)
یہ شمارہ بلاشبہ خوبصورت غزلوں، نظموں، افسانوں اور مضامین سے بھرپور تخلیقی اور ادبی مجلہ ہے جو ہمیں موجودہ دور کی سوچ اور عصر حاضر کے ادب سے ملاتا ہے۔ اور آخر میں "بیاض" اور اس کے منتظمین کے لیے دعائیں اور نیک تمنائیں۔

محمد شفیق انصاری

محترم و مکرم عمران منظور صاحب!

السلام علیکم ورحمتہ وبرکاتہ

امید واثق ہے کہ آپ اور "بیاض" کی تمام ٹیم بخیر و عافیت ہوں گے۔

مارچ 2023 کا بیاض نظر نواز ہوا۔ یہ آپ کی محنت شاقہ و محبت کا نتیجہ ہے کہ بیاض اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

ٹائٹل پر دنیائے ادب کی دو اہم اور معروف شخصیات کی تصاویر دیکھ کر دل بہت افسردہ ہوا۔ یہ دونوں شخصیات اب ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن اپنے ادبی کام کے حوالے سے تا قیامت زندہ رہیں گی۔ ماہ فروری میں جناب امجد اسلام امجد اور جناب ضیا محی الدین اس دار فانی سے اپنے ازلی مقام کی طرف روانہ ہو گئے۔ یقیناً ادب اردو ادب کے لیے یہ ایک بہت بڑا نقصان ہے۔

ابھی سوشل میڈیا سے اطلاع ملی کہ ہمارے بچپن کی یادوں میں درخشاں ایک ایماندار پولیس افسر "اندھیرا اُجالا" ڈرامہ کے مرکزی کردار جناب قوی خان لینیڈا میں انتقال فرما گئے ہیں۔

یہ دنیا بھی بس چل چلاؤ کا میلہ ہے کہ جہاں آنے کا تو ایک وقت ہے لیکن جانے کی تو کسی کو بھی خبر نہیں۔ ابھی مارچ میں والد محترم کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے ایک سال ہو رہا ہے اور ابھی تک ہم پوری فیملی اس کرب اور دکھ سے نہیں نکل پائے۔ شاید جانے والوں کا دکھ اور بڑھ جاتا ہے۔

'بیاض' کے بیک ٹائٹل پر امجد صاحب کی مختلف تقاریب کی تصاویر لگا کر ان کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

اے دیارِ وصالِ یار، بتا	ہجر کس آستاں سے ملتا ہے	خالد احمد

حصہ حمد میں:

جھوٹ ہیں، پتھروں کے نقلی خدا	رب واحد! صداقتیں تیری	خالد احمد
جہاں جاؤں، جدھر دیکھوں تو ہر شے میں نظر آئے	اسی پہ منحصر دونوں ہیں نابینا ہو یا بینا	اویس جمیل الغالی

حصہ نعت میں:

فرشتوں کا مقدر تھی محمدؐ کی غلامی	بہت سے حاضری میں تھے نگہبانِ محمدؐ	آصف ثاقب
مجھ کو نقوشِ پائے نبیؐ دستیاب ہوں	آنکھوں کو ان پہ رکھنے کی ہے میری جستجو	سید ریاض حسین زیدی
دل مدینے میں چھوڑ آیا ہوں	دلربا یاد ہے مدینے کا	نسیم سحر
میں ذرۂ ناچیز ہوں روشن تری خُب سے	ہر مہر و گرِ مہ یہاں گہنایا ہوا ہے	خاور اعجاز
خلاق سے رزق کھلیں دور آپؐ کی خوشبو	ہر قلب کو مہکائے حضور آپؐ کی خوشبو	تابش کمال
آپ معراج پہ پہنچے تو رکا وقت کا رنگ	اس کی حالت میں سکوں بھی اسی گل فام سے ہے	اعجاز دانش
رب کعبہ نے یہ قرآن میں لکھ بھیجا ہے	ان کی آواز سے اونچا نہیں بولا جاتا	اکرم ناصر
کی بات جو خدا کی خدا کے رسولؐ کی	مت سوچنا ذرا بھی دلائل کے باب میں	سرور حسین نقشبندی

عقیدت اور رباعیات بھرپور ہیں۔ خالد احمد صاحب کے حوالے سے مضامین خوبصورت اور جاندار ہیں۔ آصف ثاقب کا مضمون "خالد احمد کی غزل، اختصاریہ!" فرحت عباس شاہ "کیفیات کے ارتقا کا شاعر، خالد احمد" مضمون اس میں شاہ صاحب نے بڑی محبت اور اختصار سے خالد احمد کی غزل اور نظم کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔ نعمان منظور صاحب کا خالد احمد کی شعری چ "خالد احمد کی شاعری" اور طیبہ زمان چشتی نے خالد احمد صاحب کی فن اور شخصیت کے حوالے سے ایک زبردست مضمون لکھا۔ گوشہ خالد احمد آپ کی صاحب کی شاعری، شخصیت اور فن کے حوالے سے زبردست ہے۔

حادثوں نے کر دیا شاعر مجھے	کام یہ بھی اکتسابی ہو گیا	خالد احمد

نا فرشہزاد کا مضمون "مستنصر تارڑ اور بھگت سنگھ کی شخصیت سازی" تارڑ صاحب کے پنجابی ناول "میں بھناں دلی دے کنگرے" کے حوالے سے اور اس تناظر میں ہے۔ نوید صادق کی کتاب "رنگ زار" پر شاہد اشرف کا مضمون اور عبدالمناف نجیب کا ریاض ندیم نیازی کی کتاب "شخصیں اپنا بناتا ہے" پر مضمون زبردست ہیں۔

شوکت علی شاہ کی آپ بیتی "شاہ داستان" زندگی کے رنگوں سے بھری شیریں و تلخ یادوں کو لیے قسط وار آگے بڑھ رہی ہے۔

"گوشہ امجد اسلام" امجد صاحب کی وفات کے بعد اتنے کم وقت پر اتنے مضامین اور ان کی ذات سے وابستہ یادوں کو "بیاض" نے یکجا کر کے ایک خوبصورت خراج تحسین امجد صاحب کو پیش کیا ہے۔

امجد صاحب کی غزل کا خوبصورت شعر:

آیا ہے بہت دور سے جانا ہے بہت دور　　اس دل کے مسافر کا ٹھکانہ ہے بہت دور

اور ان کی نظم:

یہ وقت دریا ہے خواب کوئی / نہ ابتدا کی خبر کسی کو / نہ انتہا کا حساب کوئی

حصہ غزل میں:

سخن میں بھی نگارش ہیں کر دیں مصلحت نے	سرِ قرطاس بھی لفظوں کی حرمت مر گئی ہے	جمیل عالی
کارواں پہ کس طرح راہِ سفر آسان ہو	جب ہو میر کارواں کا حوصلہ ٹوٹا ہوا	جمیل یوسف
میں تو مٹی تھا انھیں بعد میں معلوم ہوا	رہ گئے تھے جو بناتے ہوئے پوری مجھ کو	راحت سرحدی
کہاں، کب کسی کا بُرا چاہتا ہوں	میں اپنے لیے راستہ چاہتا ہوں	طالب انصاری
جھوٹ دیمک کی طرح ہے چاٹ لیتا روح کو	جسم کے تاراج جو کی ہے، روح کا نقصان ہوا	انیس احمد
مت پوچھیے یہ زیست کٹی کس عذاب میں	ہر تجربہ تھا سانس میں ناکام تجربہ	خالدہ انور
عبرت کی داستاں سناتے ہیں بام و در	قصرِ ثمود و عاد میں افسردہ ملول	شہاب صفدر
یہ اس کے ہاتھ میں تھا جو بھی زاویہ دیتا	وہ جیسا چاہتا دیسا مجھے بنا دیتا	اشرف کمال
شب ہجراں ہے، میں ہوں، چاندنی ہے	ترا چھت پہ نظارہ ہو رہا ہے	وسیم جبران
آنکھ جس شخص کے خمار میں ہے	دل اسی شخص کے حصار میں ہے	عمیرا یوسف

افسانے اور تنقیدی حصہ بھرپور اور مسحور کن ہے

والسلام

رانا محمد شاہد

محترم عمران منظور و اعجاز رضوی صاحب!

السلام علیکم!

مارچ کے شمارے میں تصویری صورت خالد احمد اور امجد اسلام امجد کو خوب یاد کیا گیا۔ ہمارے ہاں ادیبوں وشاعروں کو ان کی زندگی میں نوازنے کی روایت نہیں ہے۔ تاہم خوشی ہے کہ امجد اسلام امجد کو ان کی زندگی میں ہی وہ محبت ملی جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ آصف ثاقب نے خالد احمد کی غزل اور ان کی محبت پر زبردست مضمون لکھا۔ خالد احمد کے لگائے پودے "بیاض" نے بہت سے لکھنے والوں کو ٹھنڈک دی۔ پہچان دی۔ گوشۂ خالد احمد میں فرحت عباس شاہ، نعمان منظور اور فیصل زمان چشتی نے بھی بہترین لکھا۔ اسی طرح امجد اسلام امجد کی شخصیت، یادوں اور ان کے فن پر خوبصورت تحریریں پڑھنے کو ملیں۔ حامد یزدانی، سید عارف معین، نعمان منظور، ناصر بشیر وغیرہ نے ان کی یادیں شیئر کیں۔ خصوصاً شہاب صفدر کی تحریر پڑھ کر اندازہ ہوا کہ امجد صاحب نوجوان لکھنے والوں سے کس قدر محبت کرتے تھے۔ ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ امجد اسلام امجد کی ایک غزل سے حسبِ حال شعر:

آیا ہے بہت دور سے جانا ہے بہت دور　　اس دل کے مسافر کا ٹھکانہ ہے بہت دور

آنکھوں میں نہیں خواب تو پاؤں میں نہیں دم　　اندیشوں بھری رات میں جانا ہے بہت دور

عاطف جاوید عاطف نے بھی خوبصورت نظم کی صورت امجد صاحب کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ کلیم خارجی کا افسانہ "الوارثین" پڑھتے ہوئے محسوس ہوا کہ یہ ہمارے ہی لوگوں کی کہانی ہے۔ ہمارے ہی معاشرے کی، جو حق ملکیت کے لیے لڑتے جھگڑتے ہیں۔ خون بہاتے ہیں، قتل کرتے ہیں اور پھر اسی جگہ ہماری لاشیں پڑی ہوتی ہیں۔ جس جگہ کے لیے ہم سب کچھ کر رہے ہوتے ہیں۔

"اوپر کی کمائی" بھی ایک دلچسپ افسانہ اور ہمارے معاشرے کا آئینہ تھا۔ اس اوپر کی کمائی اور اوپر کی کمائی نے شادی جیسے مقدس، سادہ اور خوبصورت رشتے کو بھی تجارت بنا دیا ہے۔ لڑکے کی اوپر کی کمائی اور لڑکی کا عمر سارا جہیز ہی کامیاب ازدواجی زندگی کی بنیاد بنا دیا ہے۔ روحانہ نوشین خان کا "ایک واڑ" اور شمینہ سید کا "تھیون گوڑ کو دھندو ہے" دلچسپ افسانے تھے۔ نظموں میں حسن عسکری کاظمی "اکیلے رو کے جیتا ہے" متاثر کن تھی۔ جانے والوں کو گلزار بخاری نے "نوحہ" کی صورت یاد کیا۔ قطب عباس قلبی کے "ماں" جیسے بے لوث رشتے کو خراجِ تحسین پیش کرتا کلام پسند آیا۔ فرحت عباس شاہ پر اعجاز رضوی نے خوب لکھا۔ انھیں پاکستان آف پرفارمنس پر مبارکباد۔

فیض رسول فیضان

مخدومی عمران منظور صاحب، محترمی نعمان منظور صاحب، مکرمی اعجاز رضوی صاحب! آداب

مارچ کا بیاض، خالد احمد و امجد اسلام امجد کی تصاویر سے مزین سرورق لئے، نظر نواز ہوا۔ خالد احمد کے حوالے سے مجھے اکثر ناسخ کا یہ شعر یاد آتا ہے:

جو خاص ہیں وہ شریکِ گروہِ عام نہیں　　شمار دانہ تسبیح میں امام نہیں

خاص الخصوص شاعر و ادیب ہونے کے باوجود خالد صاحب کو، عام اعیم لکھاریوں سے زیادہ شہرت ملی ہوئی ہے:

یہ اس کی دین ہے، جسے پروردگار دے

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ عرض بالا میں لہجہ و اسلوب کی حیثیت، اساسی حوالے کی ہے۔ امجد اسلام امجد ہر فن مولا سخن ور تھے، تاہم نظم جدید اور اُردو ڈرامے میں مرحوم کا بلند تشخص، تاریخ ادب میں نظر انداز نہیں ہو سکتا۔ میرے اُستادِ محترم، پروفیسر چودھری جاوید اقبال سدھو، امجد مرحوم اور نعیم بخاری کے یونیورسٹی فیلو ہیں۔ اکثر پرانی یادوں کو زعفرانی انداز میں تازہ کر کے شگفتہ طبعی کا سامان کرتے رہتے ہیں۔ مالک مرحومین کی مغفرت اور موجودگان کی سلامتی فرمائے۔

دوسری قومی ادبی کانفرنس کے انعقاد پر ادارۂ منہاج القرآن اور نعت فورم کے سرور حسین نقشبندی مشترکہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ یاد رہے کہ یہ مشہور زمانہ نعت، مدینہ حدت، جناب سرور حسین ہی کی لکھی ہوئی ہے:

حدودِ طائرِ سدرہ حضور جانتے ہیں　　کہاں ہے عرشِ معلّا، حضور جانتے ہیں

خدا جانے، موصوف کے مجموعۂ نعت کی اشاعت میں اتنی تاخیر کیوں ہے؟ بصد ادب و معذرت عرض ہے کہ شاعر کا بنیادی تعارف، تقریباتی نہیں بلکہ کتابیاتی ہوا کرتا ہے۔

خالد احمد اور امجد اسلام امجد پر گوشے، بھرپور اور جان دار ہیں۔ آصف ثاقب کا اختصاریہ، ایجاز پیرو جامعیہ ہے۔ علم و ادب کا ٹھاٹھیں مارتا بحر ذخار، چھلک چھلک پڑ رہا ہے گر ثاقب صاحب، کم نگاری کے بند باندھنے کی "مسائل دقلیلہ" فرماتے ہوئے بہت بھلے لگ رہے ہیں، کیا شان ہے۔ فرحت عباس شاہ نے اردا کی تنقید کی گہرائی میں ڈوب کر، خالد احمد کی اعلیٰ شاعری کی ارتقائی کیفیات پر خوبصورت روشنی ڈالی ہے۔ تحسین و ستائش! خالد صاحب کا ایک زندہ شعر:

ترکِ تعلقات پہ رویا نہ تُو، نہ میں　　لیکن یہ کیا کہ چین سے سویا نہ تُو، نہ میں

نعمان منظور نے خالد احمد کی شاعری میں تخیل، فکری، فنی انفراد خصوصاً صنائع بدائع کا سراغ عمدگی سے لگایا ہے اور کلیاتِ خالد، عرض ہنر، کے مشمولہ مجموعوں پر تفصیلی انتقادی نگاہ ڈالی ہے جس کے لئے ڈھیروں داد و آفرین! جناب خالد کا ایک پایندہ شعر:

ناقدوں نے مجھے پرکھا خالد　　خاکِ صحراؤں نے چھانی میری

فیصل زمان چشتی نے خالد احمد کے فن اور شخصیت کو دو ستانہ نہیں بلکہ حقیقی خراجِ نقد و نظر پیش کیا ہے۔ حضرت خالد کا ایک لازوال شعر:

کوئی تو روئے لپٹ کر جوان لاشوں سے　　اسی لئے تو وہ بیٹوں کو مائیں دیتا ہے

خالد احمد کی طویل نظم دریک بخش گئی ہے، سرسری نہیں بلکہ عمیق مطالعہ و محاکمہ کی متقاضی ہے۔ مختصراً یہ کہ اختر حسین جعفری اور مجید امجد کی نمایندہ منظومات کے پائے کی شاہکار نظم ہے۔

مستنصر تارڑ اور جگت سنگھ کی شخصیت سازی، لکھ کر عافر شہزاد نے جس مہارت اور فن کاری سے تاریخ آمیز اور فن آموز ناول کا قلزم، اپنے مختصر تاثراتی کوزے میں بند کیا ہے اس سے تصدیق ہوتی ہے کہ عافر صاحب خود بھی غیر معمولی ناول نگار اور توجہ طلب نقاد ہیں، بہت ہی خوب!

شاہد اشرف نے نوید صادق کی تنقیدی مضامین کی کتاب، ارتکاز، کو بجا طور پر ایک ذمہ دارانہ تنقیدی اظہاریہ قرار دیا ہے۔ نوید صادق کا حوصلہ ہے کہ انہوں نے معاصر شعرا پر اظہارِ خیال کر کے خود کو کٹھن آزمائش میں سرخرو کیا ہے۔ اعترافِ عظمت!

امجد اسلام امجد کو عامد یزدانی، سید عارف معین بلے، شباب صفدر، نعمان منظور، ناصر بشیر، محمد افتخار شفیع، سرور نقشبندی، شاہد نواز زیدی اور عاطف جاوید عاطف نے صداقت و لطافت میں گندھے ہوئے مہکار لگاتے نظم و نثر پیش کئے ہیں۔ خصوصاً یزدانی صاحب نے بڑے تحقیق نگاروں کی چھوٹی زرکسیت کی بصیرت افروز نشان دہی کی ہے۔ دیگر سلسلے بھی خوب ہیں۔ شکایت نہیں، تقاضا عرض ہے کہ اس بار میری غزل، شرفِ اشاعت سے محروم ٹھہری ہے۔ مالک آپ مدیرانِ گرامی کو مزید عزت و برکت سے نوازے۔

چراغِ شکستہ
(غزلیں)
فراست رضوی

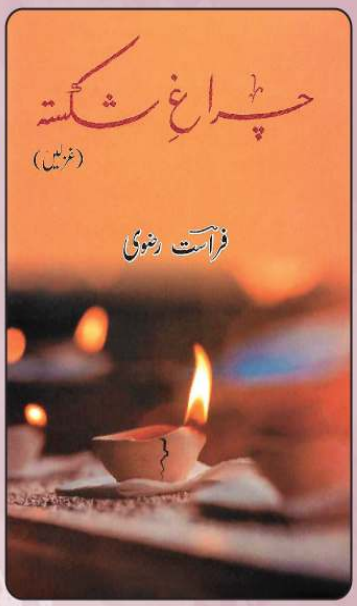

نازِ برداریاں
مطبوعہ کالموں کا مجموعہ
سلیم ناز

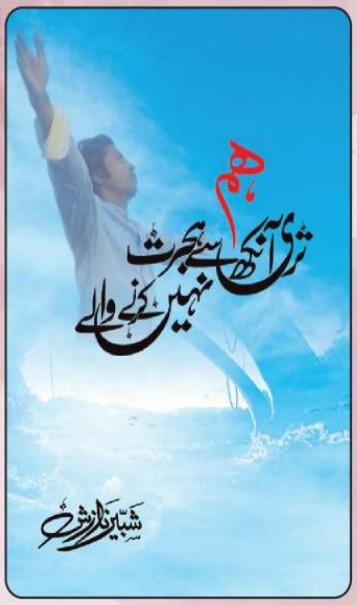

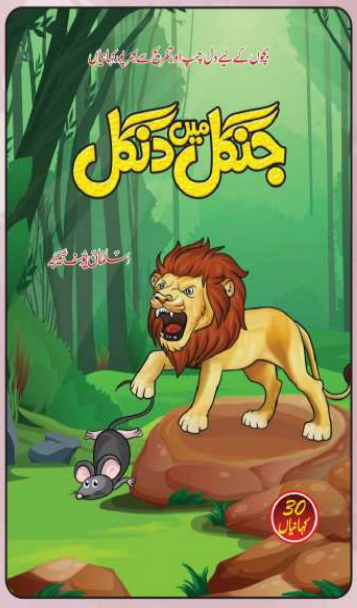

بچوں کے لیے دل چسپ اور تفریح سے بھرپور کہانیاں
جنگل میں دنگل
سلمان یوسف سمیجہ
30 کہانیاں

ہم
تری آنکھ سے ہجرت نہیں کرنے والے
شبیر نازش